جلد ۱۰۲ فروری ۱۹۸۵ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے بہترین زادِ راہ

تحریک اور کارکن

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

خلیل احمد حامدی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ۰ آفسٹ پیپر مجلد ڈائی دار

قیمت ـــــ ۳۰/- روپے

ملنے کا پتہ

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ دربار مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	فروری ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ	جلد ۱۰۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

غیر خوش آئند حالات کے باوجود خوش آئند بات ہے کہ انتخابات ہو رہے ہیں، انتخابی عمل شروع ہو چکا ہے اور یہ واضح امکان سامنے ہے کہ ملک مارشل لا کے تسلط سے نکل کر سول حکومت کے دائرے میں داخل ہو جائے۔

یہ انتخابات اگرچہ معیاری تصوراتِ جمہوریت کے مطابق نہیں ہیں اور نہ اُن کے لیے کوئی صحت مندانہ اور اصلاح پسندانہ نقشۂ انعقاد اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ اُلٹا جن اصلاحات کے وعدے اور چرچے تھے اُن کے بالکل برعکس کئی ایسی صورتیں پیدا کر دی گئی ہیں کہ مختلف بدعنوانیوں اور جعلی ووٹوں کے لیے تمام دروازے دریچے کھل گئے ہیں۔

مختلف دینی اور علمی اداروں اور شخصیتوں سے نظامِ انتخاب کی اصلاح کے لیے، اور وہ بھی خاص طور پر اسلام کے حوالے سے، جو آرا طلب کی تھیں، اسلامی نظریاتی کونسل یا انصاری کمیشن وغیرہ کی جو رپورٹیں تیار ہوئی تھیں وہ سارا کیا کرایا کام غارت ہو گیا۔ اب جنرل یحییٰ کے دور کے انتخابات اور پیش آمدہ انتخابات میں صرف یہ فرق رہ گیا ہے کہ یہ غیر جماعتی بنیادوں پر ہو رہے ہیں۔ البتہ ایک پہلو بہت قابلِ قدر ہے، وہ وہ یہ کہ پہلی بار انتخاباتِ عام ہی جداگانہ انتخاب کا وہ اُصول نافذ ہو گیا جس کے لیے محبانِ دین و ملت عرصہ سے کوشش کر رہے تھے۔

خیر جو کچھ بھی ہو، انتخابات کی ایک قدر و قیمت ضرور قابلِ تسلیم ہے۔ وہ یہی کہ یہ مارشل لا سے نجات پانے کا ذریعہ ہیں۔

کوئی بھی قوت جو کسی ملک میں جامع اصولی انقلابات کے لیے یا کسی محدود تبدیلی کے لیے سیاسی تغیر چاہتی ہو۔ اور قیادت کی صفوں کو بدلنے کا پروگرام رکھتی ہو، اس کے لیے معرکۂ انتخابات سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔ اس کے لیے انتخابات تبدیلیٔ قیادت کی ایک سعی بھی ہیں، دعوت کو پھیلانے کا ایک وسیلہ بھی، عوام کی سیاسی انتخابی تربیت کرنے اور ان کو غلط کار سیاست بازوں کے ہتھکنڈوں سے بچانے کی ایک تدبیر بھی، اور معاشرے کے اندر چھپے ہوئے سیاسی بگاڑ اور اسے پھیلانے والوں کے طور اطوار کو قریب سے سمجھنے کا ذریعہ بھی۔ علاوہ ازیں انتخابات ایک ایسا امتحان ہیں، جس کا چیلنج کسی فرد یا گروہ میں حرکت اور زندگی پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ افراد اور جماعتوں کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ان کے اپنے اپنے دائرہ ہائے کار میں ایسے چیلنج ابھرتے رہنے چاہئیں جو انہیں لمبی تانے سونے نہ دیں۔

پس خادمانِ دین کو بخوشی انتخابات کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیے اور مشکلات و موانعات کا مجاہدانہ جذبے سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ آخر وہ لوگ جو نہ اپنی دنیا بنانے اٹھے ہوں، نہ جنہیں ذاتی حیثیت سے جاہ و اقتدار کے حصول کی تونس لگی ہو اور نہ جنہیں انتخابی سیاست کو کاروبار بنا کر اس میں سرمایہ لگانا اور نفع کمانا ہو۔ ان سے زیادہ بے لوث خادمِ دین و وطن اور ان سے زیادہ جری اور نڈر کون ہوگا۔ دوسرے لوگ تو شکست کے خوف سے پہلے دن بچک جاتے ہیں اور یہ خوف بھی انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ناجائز ہتھکنڈوں سے کام لینے کی تیاری کریں ـــ جیسے وہ طالب علم جو اپنی نالائقی کی تلافی کرنے کے لیے نقل ماری کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے نگرانوں کے خلاف چاقو اور پستول لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر بھی اطمینان نہ ہو تو پرچے

دیکھنے والے ممتحنوں کو رشوت وسفارش کے ذریعے رام کرتا ہے۔ ایسے نالائق طالب علم بڑی سے بڑی ڈگری پاکر بھی ساری عمر اس اذیت احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم حقیقت میں تو نالائق ہیں۔ بالکل اسی طرح بدعنوانیوں سے انتخاب جیتنے والے سیاست باز مفاد کے دستر خوانوں پر پہنچ تو ضرور جاتے ہیں، مگر ان کے دل کا چور ہر آن اُن سے کہتا رہتا ہے کہ تم جھوٹے نمائندے اور جعلی ممبر ہو۔

جو آدمی اس پستی سے بچا ہوا ہو، اُسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

جن بااُصول، اہلِ مقصد یا پابندِ اخلاق لوگوں کو دھن، دھونس، دھاندلی کا راستہ اختیار نہ کرنا ہو اور جنہیں برادریوں، نسلوں اور طبقوں کی جاہلی عصبیتوں کے جادو سے کام نہ لینا ہو، نیز جو سرکاری مشینری اور وسائل سے استفادہ کرنے کے خواہاں نہ ہوں، اُن کی ساری فیصلہ کن قوت دعوتِ حق، رابطۂ عوام اور خدمتِ خلق سے بنتی ہے۔ اگر نظامِ اسلامی کی علمبرداری کرنے والے کسی اُمیدوار کے پیچھے یہ قوت ضروری حد تک موجود ہو تو وہ مخالفین کی ساری بدعنوانیوں کا زور توڑ کر جیت سکتا ہے اور اگر یہ حقیقی قوت مناسب حد تک موجود نہ ہو تو ایک شخص خاصی قابلیت اور پوری تگ و تاز کے باوجود شکست سے دوچار ہو سکتا ہے۔

اب اگر کسی جگہ بنیادی کام اور اس سے حاصل ہونے والی ٹھوس قوت ہی وقیع نہ ہو تو پچھلے آٹھ دس سال کی کوتاہی کار کی سزا تو بھگتنی ہوگی۔

اگرچہ بنیادی قوت کی بہت زیادہ کمی کو چند روز کی انتخابی مہم میں پورا کر لینا بہت مشکل ہوگا، مگر پھر بھی یہ امر یقینی ہے کہ اگر سیاسی بصیرت، قابلیت، محنت اور دیانت سے بھرپور کام کیا جائے ---- اور اس کے لیے دن رات ایک کر دیے جائیں ----

تو بعض صورتوں میں ناقابلِ توقع نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ ایسے کام کے لیے نشاناتِ راہ یہ ہیں:-

۱- اپنے دل کو قبل از وقت کی مایوسیوں سے اسی طرح پاک رکھا جائے جس طرح خوش فہمیوں سے۔ انتخابات کے میدانِ کارزار میں سچے جذبہ جہاد سے اُتر کر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بازی میں لگا دیا جائے۔

۲- پیشِ نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو۔ اپنے اُٹھے ہوئے ہر قدم، زبان سے نکلنے والے ہر لفظ اور جیب سے خرچ ہونے والے ہر پیسے کو جذبہ انفاق و ایثار سے خدا کی راہ میں لگا دیا جائے۔

۳- پوری کوشش کی جائے کہ تھوڑے سے وقت میں (تقریباً ایک ماہ) کارکنوں کی ۲،۲ اور ۳،۳ افراد کی ٹولیاں (یا اکیلے افراد) تقریباً ہر گھر تک پہنچیں اور ہر ووٹر سے مل کر اپنی دعوت پہنچا دیں۔ دب دب کر اور جھجک جھجک کر نہیں، بلکہ صاف طور پر اپنا پیغام دیں کہ دین کے غلبے اور ملک کی فلاح کا سارا دارومدار اچھی قیادت پر اور ایوانوں میں جانے والے اچھے نمائندوں پر ہے۔ اس پہلو سے جو کمی اب تک رہی ہے، اس کی وجہ سے صدہا خرابیاں پاکستان بننے سے لے کر آج تک ہمارے لیے مقدر چلی آرہی ہیں وغیرہ۔

۴- لسٹ میں درج ووٹروں میں سے جو فوت ہو چکے ہوں، ان کی فہرست بنائیں ہو سکے تو ان کی موت کے سرٹیفکیٹ کارپوریشن کے دفتروں وغیرہ سے حاصل کریں، ملک سے باہر یا معذور یا دیگر ووٹروں کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ عام ووٹروں کی شکل صورت، عمر کے اندازے اور تعلیم وغیرہ کا اندراج اپنے پاس رکھیں اور پھر ووٹرز لسٹ کی اپنی کاپی پر نشان لگا دیں۔

۵- خواتین ووٹروں سے ملنے کے لیے خواتین دورہ کر جائیں، بہتر ہو کہ مردوں کے ساتھ ساتھ انہی کی طرح وہ بھی کام کریں۔

۶- دوسرے چکر میں ان تک ووٹ نمبر کی پرچیاں تیار کر کے پہنچائی جائیں۔

۷- جس بھی محلے سے کچھ با اثر مرد یا عورتیں پوری طرح ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں

اُن کو آمادہ کیا جائے کہ محلّے کے جعلی ووٹروں کی نشاندہی میں مدد کریں۔

۸- اگر مضبوط قوتِ ارادی کام کرے تو ووٹروں سے دورانِ ملاقات چندے کی اپیل بھی کریں کہ وہ اس نیک کام میں مالی مدد بھی کریں۔ کیونکہ ہماری طرف سے کوئی سرمایہ دار نہیں آرہا۔

۹- خاص خاص نمایاں اور ممتاز افراد (مثلاً وکلا، اساتذہ، صحافی، تجار وغیرہ) کے پتے حاصل کرکے ان کو دانشورانہ معیار کا مختصر لٹریچر بھجوا دیا جائے۔

۱۰- ایک ٹیم پریس اور سرکاری عہدہ داروں سے رابطہ رکھنے کے لیے تیار کی جائے۔ انتخابی خبروں اور بیانوں کا ریکارڈ رکھا جائے۔ مخالفانہ باتوں کا ساتھ کے ساتھ جواب دیا جائے۔

۱۱- مرد اور خواتین الیکشن ایجنٹوں اور پولنگ ایجنٹوں اور اہم کارکنوں کو نہ صرف ضابطے اچھی طرح پڑھوا دیئے جائیں، بلکہ ضابطوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں سب کے پاس ہونی چاہئیں[1]

۱۲- یہ انتخابات چونکہ ایسے شرائط و احوال میں ہو رہے ہیں کہ بدعنوانیوں کا امکان زیادہ ہے اس لیے اس طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

الیکشن ایجنٹوں، پولنگ ایجنٹوں اور دیگر کارکنان کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے متعلقہ اتھارٹیز کو فوری اطلاع دیں۔ پہلے سے اور موقع پر اپنے ووٹروں اور حامی شہریوں کی مدد اور بعض دوسرے اُمیدواروں کے تعاون سے آواز اُٹھائیں، بلکہ ایسے تمام واقعات کا ریکارڈ رکھیں اور جو معاملات اشخاص کے ناموں اور عہدوں کے تعین کے ساتھ سامنے آئیں ان کی پوری ڈائری رکھیں اور ایسے واقعات کے متعلق دوسرے اُمیدواروں یا اُن کے پولنگ ایجنٹوں اور اپنے

[1] خصوصیت سے جو ہدایات چوہدری رحمت الٰہی صاحب کی طرف سے مجلہ "پاکستان" کے شمارہ ۲۱ میں شائع ہوئیں ان کو ضرور پڑھ لیا جائے۔

کارکنوں اور ووٹروں کی شہادتیں بھی محفوظ کرلیں۔ جہاں کیمرہ استعمال کرنے کی ضرورت ہو، وہاں کیمرہ استعمال کریں۔ کوئی گاڑی کسی غلط کام میں ملوث ہو تو اس کا نمبر نوٹ کریں۔

انتظامی اور پولیس افسروں سے رابطہ کرنے میں ناکامی ہو تو اس کی پوری رپورٹ بھی لکھ لیں کہ کس افسر کو کس وقت فون کیا گیا یا ملاقات کی کوشش کی گئی مگر رابطہ نہیں ہوسکا۔

جن بدیہی حالات و واقعات کو اخبار نویسوں کے نوٹس میں لانا ضروری ہو۔ وہ انہیں موقع پر دکھا دیئے جائیں۔ وہ ان چیزوں کو شائع کریں یا نہیں، اُن کے علم میں ہر بات آجانی چاہیے۔ اس کا بھی ریکارڈ رکھیں کہ کب، کہاں، کس اخبار نویس یا رپورٹر کو آپ نے کیا احوال دکھائے۔

ملک بھر سے جمع شدہ ایسی رپورٹوں پر مرکزی طور پر غور کیا جائے گا۔ اور ان کا مجموعہ شائع بھی کیا جاسکتا ہے ان کی بنیاد پر الیکشن ٹربیونل میں بھی جایا جاسکتا ہے۔

اگر جعلی ووٹروں کی روک تھام کے لیے کوئی مضبوط ضابطہ[1] کام کرے تو یقینی صورت میں زرِ ضمانت[2] دے کر جعلی ووٹر کے خلاف رپورٹ درج کرا دی جائے۔ اس غرض کے لیے احباب مناسب رقوم ہر پولنگ اسٹیشن پر ساتھ رکھیں۔

بھرے ہوئے کچھ ٹرک حلقہ بہ حلقہ گھومتے ہیں۔ ان کے پیچھے سکوٹر سواروں کو لگا دیا جائے، اور وہ اگر دوسرے کسی پولنگ اسٹیشن پر ووٹ ڈالنے کے لیے اُتریں تو اپنے آدمیوں کو یا کسی دوسرے اُمیدوار کے کارکنوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ جعلی ووٹروں کا ٹرک

---

[1] ضابطے موجود ہیں، سول بھی اور مارشل لا کا بھی۔ مگر ضابطے تو جبھی کام کرتے ہیں کہ انسان ان سے کام لینا چاہیں۔ اگر انسان ہی بے مہار ہو جائیں تو بیچارے ضابطے کیا کر سکتے ہیں۔

[2] غالباً چیلنج ووٹ (جس سے جعلی ووٹروں کو چیلنج کیا جاتا ہے) کے لیے دو روپے داخل کرانے پڑتے ہیں۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ پریذائیڈنگ آفیسر جعلی ووٹر کو ووٹ ڈالنے کی اجازت ہی نہ دے۔ بصورتِ دیگر چیلنج کرنا چاہیے۔

آ گیا ہے، خاص طور پر عورتوں کے بارے میں ___ اور مخصوص قسم کی عورتوں کے بارے میں پکا انتظام کیا جاتے ۔ مخبری کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگ جب صبح صبح نکلیں تو اسی وقت سے اطلاع ہو جائے کہ "چل پڑا قافلہ خیانت" ۔ اس طرح ان کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے ۔

یہ کام پوری تیاری سے کیا جا سکے تو جعلی ووٹروں کے سینوں میں گیدڑوں اور لومڑیوں کے دل ہوتے ہیں ۔ خطرہ ہو تو جلد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ۔

خاص اہتمام سے اگر بدعنوانیاں کرانے والے بڑے بڑے پہلوانوں کے کارکنوں میں سے کچھ عنصر ایسا تلاش کر لیا جائے جو اُدھر کی اسٹریٹجی سے آگاہ رکھے تو کام آسان ہو جائے گا ۔

نہایت ضروری ہے کہ بدعنوانیوں کے بل پر معرکہ آرا ہونے والے کسی "خاص" امیدوار کے بالمقابل بقیہ میں سے ۲، ۴ امیدواروں کے کارکن اس بات پر سمجھوتہ کر لیں کہ بدعنوانیوں کو روکنے میں ہم باہمی تعاون کریں گے ۔

۱۳ ___ انتخابی مہم کے لیے روانہ ہوتے وقت انفرادی یا اجتماعی دعا کر کے نکلا جائے ۔ اور واپسی پر بھی کسی مناسب وقت میں کم سے کم روزانہ ۲ نوافل ادا کیے جائیں مقصود یہ کہ انتخابات کی طوفانی سرگرمیوں میں تعلق باللہ کا رشتہ کمزور نہ ہونے پائے ۔

ایک بڑی مطلوبہ قوت اخوت و اتحاد کی قوت ہے ۔ نظام اسلامی کے علمبرداروں کو اس نعمت کی قدر کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کو ہم فکری، ہم رنگی، اور ہم آہنگی کی بنیاد پر بنی ہوئی ایک ایسی برادری عطا ہوئی ہے کہ اس دورِ بے اعتمادی و خیانت کے گندے سمندر میں ایک پاکیزہ جزیرے یا جہاز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس برادری کے رشتۂ اخوت و اتحاد میں بدگمانی، غیبت، چغلی، مفاد پرستی، نفسانیت، انانیت، غیر صحت مندانہ اختلافات اور منفیت پسندی کی وجہ سے دراڑیں پڑ سکتی ہیں

اس صورت میں گویا قلیل التعداد اور قلیل الوسائل لوگوں کی ایک بڑی قوت ضائع ہو سکتی ہے۔ ایسی ہر غلط روش سے پرہیز کیا جانا چاہیے۔ اپنے ہم سفرانِ مقصد سے محبت کیجیے، ان کے لیے ایثار کیجیے، ان کا پیٹھ پیچھے بھی احترام کیجیے، ان سے اختلاف بھی کیجیے تو بڑے خیرخواہانہ انداز سے۔

مضبوط اسلامی اتحاد کے ساتھ کارکنوں کی ٹیمیں اگر کام کریں گی تو دس بیس گنا نہیں تو چار چھ گنا زیادہ قوت ان میں پیدا ہو جائے گی۔

انتخابی مہم کی ایک لازمی کڑی جذبہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آپ یہ انتخابات دُنیوی مفاد کے لیے نہیں لڑ رہے، دین کی سربلندی کے لیے لڑ رہے ہیں، لہٰذا اس میں دل کھول کر انفاق کرنا چاہیے اور یہ نہیں سوچتے رہنا چاہیے کہ اُوپر سے کوئی ابر آکر پیسوں کی بارش برسا جائے گا۔ اپنی آسائشوں اور اپنے معیارِ زندگی کو بڑھانے کے لیے جس اندھی لگن سے لوگ کام کرتے ہیں۔ ویسی شعوری لگن انفاق فی سبیل اللہ میں بھی دکھانی چاہیے۔

انفاق خود انسان کے اپنے کردار کو بلند کرنے میں، اس کے نفس کا تزکیہ کرنے میں، اس کی قوتِ ایمانی اور قوتِ ارادی کو بڑھانے میں بہت بڑا حصہ ادا کرتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں پر خدا بھی خاص لطف و کرم فرماتا ہے۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دینِ برحق کے لیے مخلصانہ کام کرنے والوں کو اپنی تائید سے نوازے اور پیش آمدہ مہم میں عام کامیابی کے ساتھ دعوتِ حق کے فروغ اور کارکنوں کی اپنی ذہنی و اخلاقی صلاح و فلاح کا سروسامان بہم پہنچائے۔ جو کچھ مساعی ہوں ان کو وہ متاعِ آخرت کے طور پر قبول کرے۔ اور اچھی جزا دے۔

ایک اپیل

میں اپنی قوم اور خصوصیت سے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو کہتا ہوں کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھیں اور حالات کی ناخوشگواریوں کی ہرگز پروا نہ کریں، وقت کے چیلنج کا مردانہ وار سامنا کریں اور جہاں دھاندلی اور بدعنوانی ہوتی دیکھیں وہاں عوام کے تعاون سے اس کا راستہ روکیں اور یقین رکھیں کہ چوروں کے پاؤں نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ سارا کام خدا کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے کریں۔ اقامتِ دین کے جذبے سے اور پورے نظم کے ساتھ کریں اور اپنے آپ کو نفسانیت اور غلط طور طریقوں سے بچانے کی پوری کوشش کریں۔

اقتباس از بیان جناب میاں طفیل محمد قائد تحریک اسلامی
جاری شدہ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۸۵ء

حکمتِ سید مودودیؒ

اسلامی نظام، تبدیلیٔ قیادت، اصلاحِ معاشرہ اور انتخابات

(ادارہ)

(۱)

اگر فی الواقع ہمارے پیشِ نظر یہی مقصد ہے کہ یہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہو، تو اس کے لیے اوّلین ضرورت بہرحال یہ ہوگی کہ ہم یہاں کے زیادہ سے زیادہ باشندوں کو اسلامی ریاست کے نظریے سے واقف، اور اس کا قائل، اور اس کا طالب بنانے کی کوشش کریں۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ہماری ایک اکیڈمی ہو جو اسلامی ریاست کے موضوع اور اس سے متعلق مسائل پر بہترین علمی کتابیں شائع کرے اور ہم سالہا سال کی کوشش سے علومِ سیاست و اجتماع میں اپنے نظریے کا سکہ جما دیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جس وقت ہمارے ملک میں یہ سوال فیصلہ طلب ہو کہ ریاست کا نیا نظام کن بنیادوں پر تعمیر کیا جائے، اس وقت ہم میدان میں آکر عوام اور خواص سب کے سامنے اپنا نظریہ پیش کریں اور ہر ایک کو اس کی استعداد کے مطابق اسلامی ریاست کا محض تصور ہی نہ دیں بلکہ اسے اس کا قائل اور حامی اور طالب بنانے کی بھی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان جو شخص بھی موازنہ کرکے دیکھے گا اس کے لیے یہ ماننے کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ ہمارے مقصد کے لیے دوسرا طریقہ زیادہ کارگر ہے۔ آپ ہزار کتابیں لکھ کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ جس وقت کوئی اہم مسئلہ

لوگوں کے سامنے درپیش ہو اس وقت میدان میں آ کر اس مسئلے میں ان کو صحیح رہنمائی دیں۔ ایسے مواقع پر چند جملے بڑی بڑی کتابوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور ذہنوں میں اچھی طرح جذب ہو جاتے ہیں۔

(۲)

نظامِ سیاسی میں خود بخود تغیر ہو جانے اور قیادت کے آپ سے آپ بدل جانے کا عجیب و غریب تخیل تو میری فہم سے بالکل ہی بالاتر ہے۔ معاملہ اگر بخت و اتفاق کا ہو تو آدمی ہر حادثے کے ظہور کو ممکن مان سکتا ہے۔ لیکن جہاں معاملہ مطلوب نتائج کے حصول کا ہو، میری ناقص فہم میں کسی نتیجۂ مطلوب کا بھی خود بخود برآمد ہو جانا ممکن نہیں ہے، جب تک کہ انسان بالارادہ اس کے لیے کوشش نہ کرے اور خاص طور پر اُن تدابیر کو استعمال نہ کرے جو اس مخصوص نتیجے کے لیے عقل اور فطرت اور دنیا کے تجربات کی رُو سے ضروری ہیں۔ آپ اگر کسی قلعہ کو مسخر کرنا چاہتے ہوں تو بلاشبہہ قلعہ شکن آلات فراہم کرنا، حملہ آور فوجوں کو تیار کرنا، لوگوں میں اس کی تسخیر کی خواہش پیدا کر دینا، سب کچھ اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ اس کام کے یہ مقدمات جب جمع ہو جائیں گے تو قلعہ خود بخود ٹوٹ جائے گا یا قلعہ پر جو لوگ قابض ہیں وہ خود ایک روز آ کر اس کی کنجیاں حوالے کر دیں گے، محض تخیل کی بلند پروازی ہے۔ قلعہ تو جب بھی مسخر ہوگا اسی طرح ہوگا کہ جو لوازم اور مقدمات اس کی تسخیر کے لیے آپ نے فراہم کیے ہیں اُن کو عملاً اس کام میں استعمال بھی کریں۔ جو خواہش آپ نے اس کو مسخر کرنے کے لیے لوگوں میں پیدا کی ہے اسے واقعی تسخیر کے راستے پر لگائیں بھی۔ جو آلات آپ نے قلعہ کے سامنے لا کر جمع کر دیے ہیں ان سے فی الواقع قلعہ شکنی کا کام بھی لیں۔ اور جو فوجیں آپ نے تیار کی ہیں انھیں لے کر حملہ آور بھی ہوں اور اہلِ قلعہ سے زور آزمائی بھی کریں۔ یہ کام اگر سرے سے آپ کی اسکیم ہی میں نہ ہو، بلکہ پہلے ہی سے دُنیا کو یہ معلوم ہو کہ آپ "تیاریاں" کرنے اور خواہشات "اُبھار دینے" سے آگے کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور قلعہ پر حملہ آور ہونا

آپ کے پروگرام ہی سے خارج ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ سادہ لوح حریف آپ کو دنیا میں کہاں ملیں گے جو کسی وقت قلعہ خود بخود چھوڑ بھاگنے پر تیار ہو جائیں گے۔ بلکہ میرے علم میں تو ایسی سیدھی سادھی آبادی بھی دنیا میں کسی جگہ نہیں پائی جاتی جو ان خالی خولی تیاریوں کے کام میں سنجیدگی کے ساتھ آپ سے تعاون کرے گی اور آپ کے ابھارے کوئی خواہش اس کے اندر تسخیرِ قلعہ کے لیے اُبھر سکے گی۔

(۳)

تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں:

پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی و جمہوری نظام قائم ہے اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے — انتخابات۔

تیسری یہ کہ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلیٔ قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں ہے، اور اسی بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔

(۴)

کوئی ایسا شخص جو "اصلاحِ معاشرہ" کا محض لفظ ہی نہیں، بلکہ اس کے معنی بھی جانتا ہو، اُن اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو انتخابات سے معاشرے پر پڑتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ جس ملک کے نظامِ انتخابات میں رائے دہندگیٔ بالغان کا اُصول رائج ہو، وہاں تو ووٹر اور معاشرہ درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، کیونکہ معاشرے کا ہر بالغ شخص اس میں ووٹر ہوتا ہے۔ اِن ووٹروں سے اگر روپے کے عوض ووٹ خریدے جائیں،

یا طرح طرح کے دباؤ ڈال کر، یا لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کیے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے گرد و پیش ایک ضمیر فروش، لالچی اور ڈرپوک معاشرہ تیار ہو رہا ہے، اور ساتھ کے ساتھ اسی معاشرہ میں اُن دلالوں، غنڈوں اور بدکردار طالبینِ اقتدار کی تربیت بھی ہو رہی ہے جو اپنی قوم کی اخلاقی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والے ہوں۔ دوسری طرف اگر ان ووٹروں سے برادریوں اور قبیلوں اور صوبوں کے نام پر بھی ووٹ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے معاشرہ کو تنگ نظری، جاہلانہ تعصبات اور افتراق و انتشار کی تربیت بھی دی جارہی ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کے لیے وہ یہ ہتھکنڈے استعمال کریں۔ تیسری طرف اگر ووٹروں سے روٹی اور کپڑے کے نام پر، معاشی مفادات کے نام پر، یا کچھ دوسرے لادینی اُصولوں اور نظریات کی تبلیغ کر کے بھی ووٹ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پورے معاشرے کو، اس کے ایک ایک بالغ مرد اور عورت کو مادہ پرستی، دُنیا پرستی اور لادینی نظریۂ حیات کے حق میں رائے دینے کے لیے بھی تیار کیا جارہا ہے۔

انتخابات میں یہ تینوں قسم کے عناصر معاشرے کے اندر سے اپنا اپنا حصہ لے لیں گے اور انتخابات کا نتیجہ ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر آپ کو بتا دے گا کہ اُن میں سے ہر ایک نے اس کو کس قدر بگاڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اِن عناصر کو اِس تخریبِ معاشرہ کے لیے کُھلی چھٹی دے دینا اور یہ کہنا کہ ہم تو انتخابات کو چھوڑ کر صرف اصلاحِ معاشرہ کریں گے، آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

اصلاحِ معاشرہ سے اگر آپ کی مراد معاشرے کو اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے تیار کرنا ہے تو ووٹر کو صحیح انتخاب کے لیے تیار کرنا اس کے دائرۂ عمل سے خارج کیسے ہوسکتا ہے؟ اور یہ کام کیے بغیر کس طرح ممکن ہے کہ آپ کا معاشرہ کبھی فاسد قیادتوں کو ہٹا کر کوئی صالح قیادت برپا کرنے کے قابل ہوسکے؟ آپ کو اس کے لیے ووٹر کی اخلاقی قدریں بدلنی ہوں گی۔ اسے اسلامی نظام سے روشناس کرانا ہوگا۔ اس میں اسلامی نظام کی طلب پیدا کرنی ہوگی۔ اس کو صالح اور غیر صالح کی تمیز دینی ہوگی۔ اس کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ اس ملک کی بھلائی اور بُرائی کا واحد ذمہ دار براہ راست

وہ خود ہے۔ اس میں اتنی اخلاقی طاقت اور سمجھ بوجھ پیدا کرنی ہوگی کہ نہ وہ حصن کے عوض اپنا ووٹ بیچے، نہ دھونس میں آکر اپنے ضمیر کے خلاف کسی کو ووٹ نہ دے، نہ دھوکا دینے والوں کے دھوکے میں آئے اور نہ دھاندلیوں سے بد دل کر گھر بیٹھ رہے۔ یہی کام تو ہم انتخابات میں حصہ لے کر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اصلاحِ معاشرہ کا کام نہیں ہے؟ اور کیا کسی دانش مند کا یہ خیال ہے کہ اپنے ملک کے ووٹروں کو اس حیثیت سے تیار کیے بغیر یہاں کبھی انقلابِ قیادت ہو سکے گا؟

انتخابات سے الگ رہ کر آپ معاشرے کی اصلاح کے لیے جو تدبیریں اختیار کریں گے وہ لوگوں کے عقائد، طرزِ فکر، اخلاق، عادات اور معاملات کو دوسرے تمام پہلوؤں سے تو ضرور سنوار سکیں گی، مگر ان کے ذہن اور اخلاق کا یہ خاص پہلو کہ وہ اپنے ملک کی زمامِ اقتدار کس کو سونپنا پسند کرتے ہیں، اور فاسد قیادتوں کے مقابلے میں صالح قیادت کو اُوپر لانے کے لیے کتنے عزم و جزم سے کام لیتے ہیں۔ اس کی اصلاح و تربیت انتخابات کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے نہیں کی جا سکتی اور ظاہر ہے کہ انقلابِ قیادت کے معاملے میں فیصلہ کن چیز افرادِ معاشرہ کے ذہن و اخلاق کا یہی پہلو ہے۔

(۵)

آپ خود ذرا غور کر کے دیکھیں۔ یہ انتخابی ہتھکنڈے جو سیاسی پارٹیاں استعمال کرتی ہیں، اور جن کے استعمال میں زمامِ کار کے موجودہ مالک طاق بھی ہیں اور بے باک بھی، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خود بخود متروک ہو جائیں گے، کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ لوگ آپ ہی اتنے نیک ہو جائیں گے کہ ان ہتھکنڈوں کے استعمال سے انھیں شرم آنے لگے گی؟ اور کیا آپ زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے اُس ساعتِ سعید کا انتظار کرنا چاہتے ہیں جب مقابلہ صرف شریف آدمیوں سے رہ جائے اور بُرے لوگ میدان سے ہٹ جائیں؟

اگر یہ آپ کی اُمیدیں ہیں، اور یہ وہ شرطیں ہیں جن کے پورا ہونے پر ہی آپ قیادت بدلنے کے اس واحد آئینی وسیلہ سے کام لے سکتے ہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ کبھی آپ کی یہ اُمیدیں اور شرطیں پوری ہوں گی۔ اور آپ اس کارِ خیر کے لیے آگے بڑھ سکیں گے۔ تبدیلیِ قیادت کے لیے آپ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اس گندے کھیل میں پاکیزگی کے ساتھ آئیے۔ تمام بُرے ہتھکنڈوں کا مقابلہ صحیح طریقوں سے کیجیے۔ جعلی ووٹوں کے مقابلے میں اصلی ووٹ لائیے۔ دھن سے ووٹ خریدنے والوں کے مقابلے میں اُصول اور مقصد کی خاطر ووٹ دینے والے لا کر دکھائیے۔ دھوکے اور فریب اور جھوٹ سے کام لینے والوں کے مقابلے میں سچائی اور راست بازی کا مظاہرہ کیجیے۔ دھونس اور زبردستی سے ووٹ لینے والوں کے مقابلے میں ایسے ووٹر پیش کیجیے جو بے خوف ہو کر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دیں۔ دھاندلیوں کے مقابلے میں مخلصانہ ایمان داری برت کر دکھائیے۔ ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ ناکامی ہو تو ہو۔ آپ کوئی تبدیلی یہاں لا سکتے ہیں تو اسی طریقے سے لا سکتے ہیں۔ اسی طرح آخر کار وہ وقت آئے گا جب کہ سارے ہتھکنڈوں کے باوجود غلط کار لوگ شکست کھا جائیں گے۔ اسی طرح یہاں کے انتخابی نظام کی بُرائیاں بے نقاب ہوں گی۔ اسی طرح اِن بُرائیوں کے خلاف عام نفرت اور بیزاری پیدا کی جا سکے گی۔ اسی طرح انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کا راستہ کُھلے گا۔

(۶)

پارلیمنٹری نظام میں ایک پارٹی کی طاقت صرف اس کے ممبروں کی تعداد کے مطابق ہی نہیں ہوا کرتی۔ متعدد پارٹیوں کے ایوان میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ توازنِ قوت ایک قلیل التعداد گروہ کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ ابن الوقت اور غرض پرست گروہ ایسے مواقع کو سودے بازی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی منظم گروہ وہاں موجود ہو جو اپنے سامنے ایک بلند مقصد رکھتا ہو اور صرف اپنے مقصد ہی کی خاطر اختلاف اور

اتفاق کر سکتا ہو، تو وہ قلیل التعداد ہونے کے باوجود بڑی بڑی پارٹیوں سے اپنی بات منوا سکتا ہے، اور اس کی متعدد مثالیں آپ خود اپنے ملک میں دیکھ چکے ہیں۔ پاکستان میں اس وقت سیاسی پارٹیوں کے جو رنگ ڈھنگ ہیں، اور اسمبلیوں میں پہنچ کر وہ جس طرح آپس میں اقتدار کے لیے کشمکش، اور ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرتی ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ مضبوط سیرت رکھنے والے چند آدمیوں کا ایک چھوٹا سا بلاک بھی اگر ان کے درمیان موجود ہو تو وہی ان سب پر حکمرانی کر سکتا ہے۔

(اقتباسات از تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل)

میرے مشاہدات و تجربات

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

تجربات

میں نے پچھلے شمارے میں ناگوار اور تلخ مشاہدات میں سے چند ایک کا ذکر بطور نمونہ کر دیا ہے۔ اب ہم چند تجربات کی بات کرتے ہیں۔

۱ــــ دنیا میں سب سے پہلا تجربہ یہ ہوا کہ غم و الم اور دکھ درد ہر انسان کی خالص ذاتی متاع ہے جو ناقابلِ انتقال اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ ہر الم کا دکھ اور ہر زخم کا درد انسان کو خود ہی سہنا ہوتا ہے۔ اس میں دوسرا کوئی چاہے بھی تو شریک نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ یہ دونوں احساسات خالص داخلی اور ذاتی ہیں۔ تسلی، تشفی، سکون بخش خارجی عوامل ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ حقیقی الم وہی سہتا ہے جسے غم لاحق ہوتا ہے اور حقیقی درد اسے ہی محسوس ہوتا ہے جسے وہ زخم لگتا ہے۔

۲ــــ دنیا میں مجھے دوسرا تجربہ یہ ہوا کہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ ناگوار چیز اختلاف رائے ہے۔ جس کو بھی ناراض کرنا ہو اس سے اختلاف رائے کر کے دیکھ لیجیے۔ اختلاف رائے کو کوئی برداشت نہیں کرتا۔ حکمرانوں سے کریں تو وہ جیل میں

ڈالے ہیں۔ جماعتوں میں کریں تو وہ پیچھے دھکیلتی اور کونے میں لگانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بزرگوں سے کریں تو وہ بے ادب شمار کرتے ہیں۔ امراء سے کریں تو وہ رزق سے محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھوٹوں سے کریں تو وہ لاپروائی، عدم دلچسپی اور عدم توجہ کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ بغرض اختلاف رائے جسے دنیا کی ترقی اور خوشحالی کے عوامل میں شمار کیا گیا ہے اگر حدود و ضوابط کی پابندی نہ ہو تو اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا جب کہ یہی اختلاف رائے ترقی اور مادی خوشحالی کے بنیادی عوامل میں شمار کی جاتی ہے۔ انسانی تجربہ سب سے کڑوی چیز تنقید اور سب سے شیریں چیز خوشامد کو ظاہر کرتا ہے۔ جب کہ ان دونوں کے نتائج متضاد اور مختلف ہوتے ہیں۔ اسلام نے تنقید کرنے والے کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور خوشامد کرنے والے کے منہ میں خاک جھونکنے کی تعلیم دی ہے لیکن اس پر عمل کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

۳۔ ایک تجربہ یہ ہوا کہ انسان چونکہ اجتماعیت پسند ہے اس لیے اسے غیر اُصولی اجتماعیت کے اندر بھی اپنی ایک اُصولی اجتماعیت بنا کر ہی رہنا چاہیے۔ اگر وہ تنہا رہنے کی کوشش کرے گا تو اسے بہت چرکے لگیں گے۔ اگر وہ اپنے ہم خیالوں کا ایک گروہ بنا کر یا کسی ایسے گروہ میں شامل ہو کر جو اس کے ایمان و مقاصد کے مطابق ہو، ان کے درمیان رہے گا تو یہ ہم خیال اُس کے لیے حصار کا کام دیں گے اور وہ ان کے لیے حصار ہوگا۔ یہی ہمدردی کا حصار اُسے مشکل وقت میں دشواریوں سے بچائے گا۔ اور دُکھ درد میں ہمدردی کا اظہار کرے گا۔ اور مخالفوں کے مقابلے میں رعب و دبدبہ کا ذریعہ ہوگا۔ اس داخلی اجتماعیت کی ایک فطری مثال خاندان بھی ہے جسے یورپ نے تباہ کر کے افراد کی کمزوری کے درد کو اور بھی زیادہ دردناک بنا دیا ہے، مگر واضح رہے کہ خاندان ایمانی اور اُصولی ساخت نہیں رکھتے

انسانوں کی برادری میں اس اجتماعیت کی ایک نہایت درجہ وسیع صورت ہمارا

ملک پاکستان بھی ہے جسے مسلمانوں نے منفی اور مثبت دو جذبات کے تحت حاصل کیا تھا۔ منفی جذبہ بھی ایک لازمی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ جب تک لَآ اور اِلَّا کی منفی اور مثبت دونوں قوتیں آمنے سامنے نہ آئیں کوئی زوردار قوت وجود میں نہیں آتی۔ کلمہ طیبہ میں تمام خداؤں کی نفی کی قوت سے ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات ہوتا ہے۔ اس صورت میں کلمہ طیبہ ایک جہادی قوت کا نشان بن کر نمودار ہوتا ہے۔ پاکستان بھی جابر اور ظالم کفار کے ظلم و جور کی نفی کے جذبے اور اسلامی نظام کے مثبت جذبے کے زور سے وجود میں آیا تھا پوری قوم میں ان دونوں جذبات کی شدت نے اتنی قوت پیدا کر دی تھی کہ ہر قسم کے سروسامان سے محرومی کے باوجود برصغیر کی ملتِ مسلمہ ایک علیحدہ خطۂ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور آج قوموں کی برادری میں پاکستان کی اجتماعیت ہماری زندگی اور آزادی کی ضمانت ہے۔ اگر ہم کفر کے مقابلے میں جذبہ نفی اور اسلام کے حق میں جذبۂ اثبات کو آج بھی اسی قوت سے مجتمع کریں تو پاکستان دنیا کی عظیم قوت بن سکتا ہے۔

---

۴ - میں نے ادب کے میدان میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر نگارشات کا آغاز کیا تو اس دائرے میں بہت سی واہ واہ سے واسطہ پڑا لیکن زندگی کے گہرے مطالعہ کے بعد ایک خاص موڑ پر پہنچ کر جب میں نے ادب کی ترقی پسند تحریک کو اشتراکی نظریات کی علمبردار تحریک ظاہر کیا جو اسلامی تصوّرات سے متصادم تھی تو مجھے اپنے اس حلقۂ احباب میں سخت مذمت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے تجربہ ہوا کہ ادب میں واہ واہ اور مذمت دونوں ہی اضافی چیزیں ہیں۔ درحقیقت نظریات کی یگانگت کی بنا پر لوگ واہ واہ کرتے نظریات کے اختلاف کی بنا پر مذمت کرتے اور جس کے نظریات کا علم نہ ہو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ تعریف و مذمت کا بیشتر انحصار نظریاتی موافقت و مخالفت پر ہے۔ یہ دو نظریات کا دور ہے اور محض ادب برائے ادب کی بات پرانے زمانے کی بات ہے۔

---

۵ — اکتوبر ۱۹۳۹ء میں سانکلی اسٹریٹ نمبر ۳ بمبئی کی ایک گلی میں عشاء کی نماز کے بعد مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ بمبئی میں یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ میں اُس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا، اور بڑے جوش و خروش سے دریاں کرسیاں اور اسٹیج سجانے کے انتظامات میں مصروف تھا۔ اس چھوٹے سے محلے کے چھوٹے سے جلسے میں صوبائی مسلم لیگ کے صدر مسٹر ابراہیم اسماعیل چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شوکت علی، مولانا عرفان، مولانا جمال میاں فرنگی اور خود قائداعظم بھی تشریف لا رہے تھے۔ ہم لوگوں پر مسلمانوں کے جداگانہ وجود کا احساس غالب تھا۔ جوش و خروش کے لحاظ سے مولانا جمال میاں فرنگی محل کی تقریر اور جذبۂ خلوص و متانت کے لحاظ سے قائداعظم کی تقریر ہمیں بہت پسند آئی۔ میں اس سرور کو آج بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے جب قائداعظم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا:

”ہم محمد رسول اللہ کی اُمت ہیں۔ ہم ہر لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہمارا قانون قرآن ہے“۔

سیاست میں دین کا یہ واضح اثر میرے لیے انتہائی سرور انگیز تجربہ تھا جس کی شیرینی اب تک محسوس ہوتی ہے اور قائداعظم کے جذبہ و خلوص اور خدمتِ اسلامی کی گواہی دیتی ہے۔

---

۶ — پرکاش چندر میرا بڑا گہرا دوست تھا اور دہلی سیکرٹریٹ کے دفتر میں میرے سامنے کام کرتا تھا۔ لاہور کا رہنے والا تھا۔ اپنے آپ کو انتہائی آزاد خیال اور تنگ نظری سے دُور ظاہر کرتا تھا۔ وہ چند دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ مجھے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کباب بہت پسند ہیں، تم بھی میرے ساتھ چلو تو مل کر کھائیں۔ میں مسلسل ٹالتا رہا اور وہ ہمیشہ تقاضا کرتا رہا۔ ایک بار ہم دریا گنج کی طرف سے سیر کر کے آ رہے تھے کہ وہ بضد ہو گیا چنانچہ ہم جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کبابیوں کے پاس چلے گئے اور کباب کھائے۔ پھر واپس آتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ ”مسٹر گیلانی آپ نے دھوکے سے مجھے بڑا

گوشت کھلا کر میرا مذہب خراب کیا ہے۔ میں اس کی شکایت اپنے دفتر میں بھی کروں گا اور آریہ سماج کے دفتر میں بھی"۔

"مَیں نے تو تمھیں کچھ نہیں کھلایا تم خود ہی بضد تھے - تم خود وہاں گئے، پیسے بھی تم نے خود ادا کیے" میں نے جواباً کہا۔

"نہیں میں نہیں جانتا تم ہی مجھے بڑے گوشت کی دکان پر لے گئے تھے اور تم ہی اس کے ذمہ دار ہو"۔ اُس نے پھر تکرار کے ساتھ دہرایا - چنانچہ اُس نے دفتر میں میرے خلاف یہ شکایت لکھ کر دی اور پھر نامعلوم کہاں کہاں وہ اس بات کو پھیلاتا پھرتا رہا۔

اس سے مجھے یہ تجربہ ہوا کہ ہندو کا کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے وہ بےحد مکار ہوتا ہے۔

۷- سردار لال سنگھ روپڑ (مشرقی پنجاب) کا رہنے والا تھا اور دہلی سیکرٹریٹ میں میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے لیے تحریک زوروں پر تھی اور پاکستان ہر شخص کی زبان پر سب سے اہم موضوع تھا۔ مَیں شب و روز سردار لال سنگھ سے پاکستان، خلافتِ راشدہ، عمر فاروق کا دَور، اسلام نظامِ مملکت، اسلامی حکام کی خدمت اور کردار کی باتیں اور مثالیں پیش کیا کرتا تھا - اور اسلامی معاشرے میں مساوات، اخوت، معاشی فراغت، غریبوں کے بارے میں احساسِ ذمہ داری اور خلفائے راشدین کے خدمتِ خلق کے کارنامے بیان کیا کرتا تھا اور اس سے کہا کرتا تھا کہ سکھوں کو بھی پاکستان میں ہی شامل ہونا چاہیے - ایک دن سردار سنگھ نے مجھ سے کہا۔

"گیلانی صاحب، جس پاکستان کی تصویر آپ پیش کرتے ہیں اگر وہ ایسا ہی ہوگا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے پاکستان میں لال سنگھ سر کے بَل چل کر حاضر ہونا اور اس کی سڑکوں پر اپنے کیس اور داڑھی سے جھاڑو دینا بھی قابلِ فخر سمجھے گا - اے کاش کہ پاکستان ایسا ہی ہو تو وہ انسانیت کے لیے جنت کا نمونہ ہوگا اور لوگ اسے دیکھنے کو آئیں گے"

اب میں سردار لال سنگھ سے کہی ہوئی اپنی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ وہ اگر کبھی ننکانہ صاحب زیارت کے لیے پاکستان میں آیا ہو گا تو میری باتوں کے بارے میں اس نے کیا سوچا ہو گا؟ میرے احساس کی تلخی کا تجربہ آج بھی اس واقعہ کی یاد سے وابستہ ہے۔

مرحوم مشرقی پاکستان میں اکثر سیلاب آیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء کے سیلاب بہت خوفناک تھے، جن میں امداد کے لیے مغربی پاکستان سے میں بھی ایک امدادی کیمپ میں رضاکار کے طور پر گیا تھا۔ سیلابوں کے بعد تبلیغ اور تنظیم کے سلسلے میں مَیں وہاں ٹھہر گیا۔ اپنے ایک "مکتوب مشرقی پاکستان" میں جو ماہنامہ چراغ راہ کراچی میں چھپا تھا مَیں نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا تھا کہ مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدیں کھلی ہونے کے سبب کثرت سے لوگ سمگلنگ کے کاروبار میں مصروف ہیں جس کا بُرا اثر مشرقی پاکستان کی معیشت پر پڑتا ہے۔ تقریباً بیشتر جیوٹ بہت ہی سستے داموں بنیے خرید کر بھارت لے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں مَیں نے بہار کے مہاجرین کا ذکر بھی کیا کہ بنگال کے ساتھ بہاری سرحدیں ملنے کے سبب بہاری مہاجر بھی کثرت سے بھارت آتے جاتے ہیں۔ اور سمگلنگ کی بہت سی صورتوں میں سے یہ آمدورفت بھی ایک صورت بن جاتی ہے۔ میرے اس مطبوعہ مکتوب کی بے شمار نقول کر کے فتنہ پرور لوگوں نے سید پور میں پھیلائیں جو بہاری مہاجروں کا شہر تھا۔ اور ان دنوں میری رہائش بھی وہیں پر تھی۔ چنانچہ سارے شہر میں میرے خلاف دستی پوسٹر لگے۔ اخباروں میں غم و غصہ کے بیان چھپے اور میرے مکان پر رات کو شرابیں پی کر مظاہرہ کیا گیا۔

اس ہاؤ ہو میں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے شہر چھوڑ دینا چاہیے لیکن میں نے احباب سے کہا کہ وہ ایک کھلے جلسے کا اہتمام کریں۔ چنانچہ میونسپل پارک میں جلسے کا اہتمام ہوا اور سارے شہر میں اعلان کر کے مَیں نے ایک بھرپور جلسے سے ایک گھنٹہ خطاب کیا۔ چند مخالفانہ نعرے بھی لگے لیکن جلسے کے بعد سارے شہر کی

فضا بدل گئی اور لوگوں نے اس صاف گوئی اور جرأت کی تعریف کی، جو اُن کی توقع کے خلاف رونما ہوئی تھی۔ اس سے مجھے تجربہ ہوا کہ مخالفت میں فرار کی بجائے جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے اثرات خوشگوار ہوتے ہیں۔

بلاشبہ اس زندگی میں ہر انسان بے شمار مشاہدات و تجربات سے گزرتا ہے لیکن اس نامکمل دُنیا کی فانی اور نہایت درجہ محدود زندگی کے مشاہدات و تجربات کی حقیقت ہی کیا ہے؟ انسان کی ہستی کا جو تناسب اس وسیع و عریض کائنات میں ہے اس کی حیثیت ایک عظیم الشان صحرا میں حقیر ترین ذرّے اور بحر بے کنار میں حقیر ترین قطرے سے بھی کم ہے۔ اَن گنت کہکشانوں کی کائناتی وسعت میں جہاں ہزاروں نظام ہائے شمسی دریافت ہو چکے ہیں، ان نظام ہائے شمسی میں سے ایک چھوٹے سے نظامِ شمسی کے اربوں سیاروں میں ہماری زمین ایک حقیر سے ڈھیلے کی حیثیت رکھتی ہے جو کروڑوں مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس کا بھی محض ایک چوتھائی حصہ آباد ہے جو اربوں انسانوں کی قرارگاہ ہے۔ ان اربوں انسانوں کی لامحدود آبادیوں کے محلوں، شہروں اور گلیوں میں اَن گنت انسان نامعلوم تشخص کے ساتھ رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی حیثیت اس وسیع کائنات میں ایک خلیے سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات کے اس وسیع سلسلۂ تخلیق میں ایک بے حیثیت خلیے جیسے انسانی وجود کے مشاہدات و تجربات کا کیا تذکرہ کیا جاسکتا ہے جو محدود ترین علم اور انتہائی سطحی مشاہدہ رکھتا ہے۔

حقیقی تجربات تو وہی ہیں جو خالقِ کائنات نے اپنی کتابِ ہدایت میں قوموں کے عروج و زوال اور ان کے اسباب کے تذکرے میں خود بیان کیے ہیں اور حقیقی مشاہدات بھی وہی ہیں جو مالکِ کائنات نے مظاہرِ فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے انسانی فکر و نظر کے دریچے کھولنے کے لیے بیان کیے ہیں۔ اسی قرآنِ ہدایت اور فرقانِ سعادت میں انسانیت کے لیے سیدھا راستہ موجود ہے اور ہم سب اسی سیدھے راستے کی متلاشی اور اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔

کتاب سازی و کُتُب خانہ سازی

(اسلام کا ایک ثقافتی ورثہ)

جناب محمد حلیم چشتی صاحب

(۲)

دو قسم کے کتب خانوں کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ عہدِ رسالت سے چوتھی صدی ہجری تک مسلم معاشرے میں دو قسم کے کتب خانوں کی ہر جگہ کثرت رہی ہے:

اوّل وہ کتب خانے جنہیں عرفِ عام میں زندہ کتب خانہ کہا جاتا تھا۔ یہ سامانِ کتابت کی قیود سے آزاد تھے۔

دوسرے وہ کتب خانے جن کا وجود سامانِ کتابت کا مرہونِ منت ہے۔ آج فن کی اصطلاح میں اسی کو چند قیود کے ساتھ کتب خانہ کہا جاتا ہے۔ یہ اسلام کا فیضان ہے کہ مسلمانوں نے صدیوں تک دونوں قسم کے کتب خانوں کا سلسلہ برقرار رکھا۔

وہ زندہ کتب خانے (مکتبات حیّہ) جن سے بلا قیدِ زمان و مکان ہر جگہ فائدہ اُٹھایا جاتا تھا، یہ علوم و معارف کے گنجہائے گراں مایہ علماء و محدثین، فقہاء و مفسرین، ادباء ائمہ لغت کے صدور (سینے) تھے، جن میں وہ سب کچھ محفوظ تھا جو اُنھوں نے رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وسلّم اور معاصرینِ صحابہ رضؓ سے سُنا اور شب و روز غور و فکر کے بعد خود سمجھا تھا، چنانچہ خلفاءِ اربعہ و عبادلہ، یعنی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن عمر، مجتہدین و حفاظ اور مکثّرین (کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم)

کی جاتی[1] اسی قسم کے کتب خانوں کی نظیر تھی - اس لیے کہ جب اُن سے کچھ پوچھا جاتا وہ بے کم و کاست اُسے بیان کر دیتے۔ ان کے بعد ان کے نامور تلامذہ کی بھی یہی شان تھی۔ چنانچہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری (۵۸ - ۱۲۴ھ = ۶۷۸ - ۷۴۲ء) کا واقعہ کتبِ تاریخ و تذکرہ میں محفوظ ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک اموی (۷۱ - ۱۲۵ھ = ۶۹۰ - ۷۴۳ء) نے امام زہری کو بُلا کر فرمائش کی کہ صاحبزادوں کو کچھ حدیثیں املا کروائیں۔ اُس نے پسِ پردہ کاتب کو بٹھایا تاکہ وہ دیکھ نہ سکیں اور ہدایت کی کہ جو بیان کریں اُسے قلمبند کیا جائے۔ موصوف نے چار سو حدیثیں املا کرائیں۔ کچھ عرصہ بعد ہشام نے زہری سے عرض کیا: وہ ذخیرہ جو املا کرایا گیا تھا گم ہو گیا ہے۔ امام موصوف دوبارہ املا کرانے پر آمادہ ہو گئے۔ ہشام نے حسبِ سابق کاتب کو ہدایات دیں۔ امام زہری تو وہ حدیثیں املا کرا کر رخصت ہو گئے۔ خلیفہ ہشام نے ان کا مقابلہ کیا، سرِمُو فرق نہ پایا[2]۔ حفظ کا یہ انداز عربوں کی طبیعت و مزاج کے عین مطابق تھا۔ وہ جو کچھ سُنتے اُسے حافظہ کی قید میں محفوظ رکھتے تھے۔ اِن وجوہ سے ابتدائی دور میں اس قسم کے زندہ کتب خانوں کو مُسلم معاشرے میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔

اِس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم معاشرے میں ابلاغِ علم اور کتب خانوں کی یہ وہ زندہ تحریک تھی جس نے مادی کتب خانوں کی تحریک کو ابتدا میں بہت سہارا دیا۔

---

[1] ابن حزم، الرسالۃ الثانیۃ، اسماء الصحابۃ الرواۃ وما لکل واحد من العدد، ص ۲۷۵ - ۲۷۶ (وله) الرسالۃ الثالثۃ، اصحاب الفتیا من الصحابۃ ومن بعدهم علی مراتبهم فی کثرۃ الفتیا۔ ص ۳۱۹ - یہ دونوں رسالے جوامع السیرۃ وخمس رسائل اخری تحقیق احسان عباس، ناصر الدین الاسد، مصر، دار المعارف، ب ت میں شامل ہیں۔

[2] ابن حجر، تہذیب التہذیب، حیدر آباد الدکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۳۲۵ھ، جلد ۹ ص ۴۴۹ -

ابتدائی دور میں وسائل و سامانِ کتابت کی اتنی فراوانی نہیں تھی کہ ہر جگہ اور ہر وقت اسے بآسانی حاصل کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے قرآن مجید کبھی کھال پر، کبھی پتھر پر، کبھی ہڈی وغیرہ پر لکھوا کر محفوظ کیا گیا تھا[1]

دوسرے وہ کتب خانے تھے جو "الکتاب" کے پر توفیض اور "قیدوا العلم بالکتاب" کی تحریک سے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ اس تحریک نے عربوں کی طبیعت و مزاج کو بدلا۔ انہوں نے کتابت و ابلاغِ علم کو ایک امانت و فریضہ سمجھ کر کتابی صورت میں منضبط کرنا شروع کیا تاکہ اس ثقافتی ورثہ سے زیادہ سے زیادہ افادہ و استفادہ کیا جاسکے۔ اس طرح علوم و حکم کو صدور سے سطور (کتابوں) میں اور سینوں سے سفینوں میں منتقل کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور مسلم معاشرے میں کتب خانوں کا قیام عمل میں آنے لگا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو بن العاص قرشی (۷ ق ھ — ۶۵ ھ = ۶۱۶ — ۶۸۴ ء)[2]، ابوہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر دوسی (۲۱ ق ھ — ۵۹ ھ = ۶۰۲ — ۶۷۹ ء)[3] اور عبداللہ بن عباس (۳ ق ھ — ۶۸ ھ = ۶۱۹ — ۶۸۷ ء)[4] رضی اللہ عنہم کے کتب خانے اس کی بہترین مثال ہیں۔ جو ذخائر ان کے کتب خانوں میں محفوظ تھے ان کی حیثیت مذکرات کی ہو یا مدونات کی، وہ سب ان کے حافظوں میں محفوظ تھے۔

---

[1] ابوعبید القاسم بن سلام غریب الحدیث حیدرآباد الدکن، مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ ۱۹۶۷ء جلد ۴ ص ۱۵۶۔ ابن حجر، فتح الباری۔ مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۷۸ھ جلد ۱۰ ص ۳۸۳۔ العینی، عمدۃ القاری القاہرہ: ادارۃ الطباعۃ المنیریہ۔ ب،ب۔ جلد ۲۰۔ ص ۱۶۔ ۱۷۔ عبدالحی الکتانی۔ التراتیب الاداریۃ۔ الرباط، المطبعۃ الوطنیۃ، ۱۳۴۹ھ جلد ۲ ص ۲۴۲۔ ۲۴۳ و ۲۴۸۔

[2] ابن حجر، فتح الباری۔ جلد ۱ ص ۲۱۷۔ ۲۱۸

[3] ایضاً۔

[4] ابن سعد۔ طبقات الکبیر، لیڈن: بریل، ۱۳۲۵ھ۔ جلد ۵۔ ص ۲۱۶

اسلامی فتوحات کا دائرہ جب وسعت اختیار کر گیا۔ اقوامِ عالم جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں — وہ عربوں کی طرح ہر بات کو یاد رکھنے کی عادی نہ تھیں، نہ ان کا حافظہ ان کی طرح قوی تھا۔ اس لیے " قیدوا العلم بالکتاب " کی تحریک کو اور بھی فروغ حاصل ہوا، اس اثنا میں گو علوم و فنون میں تنوع ہوا، کھرے سکوں کے ساتھ کھوٹے سکے بھی بازارِ علم میں آنے لگے[1]۔ اسلام کی بدولت علمی سیادت و قیادت موالی کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے علمی مسندوں کو زینت بخشی اور ابلاغِ علم کی خاطر تصنیف و تالیف میں سرگرمِ عمل ہوئے[2]۔ لوگوں کی جب ہمتیں جواب دینے لگیں۔ اور ائمہ فن کو علم کے برباد ہونے کا خطرہ ہوا تو انہوں نے تیزی سے سینوں سے سفینوں میں علوم و معارف کو اتارنا شروع کیا۔ گو درس و تدریس کا انداز نہیں بدلا، اس لیے کہ انہوں نے عربوں سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ اور یہ انہی کے طریقہ تعلیم کے دلدادہ تھے، چنانچہ علوم کی تحصیل اسی طرح حافظہ سے کی جاتی رہی[3]۔

---

[1] چنانچہ امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) کا بیان ہے کہ:۔
" اسکندریہ میں ایک شیخ آیا جو نافع مولیٰ ابن عمرؓ سے روایتیں بیان کرتا تھا۔ میں نے بھی اس سے دو فنداق (بڑی بڑی کاپیاں) نقل کیں اور انہیں نافع کو بھیجا، موصوف نے ان روایات سے انکار کیا۔ (السیوطی، تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص۔ تحقیق محمد الصباغ، بیروت۔ المکتبۃ الاسلامی، ۱۳۹۳ھ ص ۱۶۷)۔

[2] ابن عبد ربہ، کتاب العقد الفرید، تحقیق احمد ابن احمد الزین۔ ابراھیم الابیاری۔ ط۔ ۲، القاھرہ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، ۱۳۷۲ھ ص ۴۱۵ ۔ ۴۱۶ ۔ یاقوت، معجم البلدان، بیروت، دار صادر، ۱۳۷۴ھ جلد ۲ ص ۳۰۷ ۔ ابن خلدون ۔ المقدمہ، بیروت، دار الکتاب اللبنانی، ۱۹۶۱ء ص ۱۰۴۷ ۔

[3] استحبوا ان یؤخذ عنہم حفظاً کما اخذوا حفظاً (ابن حجر۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۲۱۸ ۔

وسائلِ کتابت کی فراہمی

یہی وہ زمانہ تھا جب وسائل و سامانِ کتابت بآسانی میسر ہونے لگا تھا، کاغذ کے کارخانے اسلامی قلمرو میں لگنے شروع ہوگئے تھے۔ کاغذ جب سہولت سے ملنے لگا تو ہر طرف قسم قسم کا علمی ذخیرہ جمع کیا جانے لگا۔ اسلامی قلمرو میں شہر شہر اور بستی بستی ہی نہیں بلکہ گلی گلی مادی کتب خانے قائم ہونے لگے اور سینوں کے ساتھ سفینوں میں علوم کا ذخیرہ کیے جانے کا ترقی پذیر سلسلہ مسلم معاشرے کا شعار بن گیا۔ اس طرح ہر دو قسم کے کتب خانوں کا باہمی سفر شروع ہوا۔ جہاں ایک پایا جاتا وہاں دوسرا بھی ساتھ ہی ملنے لگا۔ ہر دو نوع کے کتب خانوں کے تلازم کا یہ سلسلہ چوتھی صدی ہجری تک اپنے عروج پر رہا۔

اس دعوے کے ثبوت میں بطور گلے از گلزارے مختلف ادوار سے چند نامور ائمہ لغت، ادیب، طبیب اور حفاظِ حدیث کے نام بالترتیبِ زمانی ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں جن کے کتب خانوں کے ذخائر کم و بیش ان کے صدور میں محفوظ تھے۔

دوسری صدی ہجری:

۱۔ ابو عمرو بن العلاء بن عمار مازنی بصری المتوفی ۱۵۴ھ کا کتب خانہ۔
۲۔ امام سفیان ثوری کوفی المتوفی ۱۶۱ھ کا کتب خانہ۔

تیسری صدی ہجری:

۱۔ ابو اسحاق ابراہیم بن اسحاق بغدادی حربی المتوفی ۲۸۵ھ کا کتب خانہ۔
۲۔ امام احمد بن حنبل شیبانی المتوفی ۲۴۱ھ کا کتب خانہ۔
۳۔ ابو العباس احمد بن یحییٰ المعروف بثعلب المتوفی ۲۹۱ھ کا کتب خانہ۔
۴۔ ابو زرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم رازی المتوفی ۲۶۴ھ کا کتب خانہ۔
۵۔ ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن جعفر المعروف بابن المدینی المتوفی ۲۳۴ھ
۶۔ ابو عثمان عمرو بن بحر جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ کا کتب خانہ۔
۷۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ کا کتب خانہ۔

چوتھی صدی ہجری:

۱- ابوعبداللہ ابن اسحاق اصبہانی المعروف بابن مندہ المتوفی ۳۹۵ھ کا کتب خانہ

۲- ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب شامی طبرانی المتوفی ۳۶۰ھ کا کتب خانہ

۳- ابوبکر محمد بن زکریا رازی المتوفی ۳۱۱ھ کا کتب خانہ۔

۴- ابوعبیداللہ محمد بن عمران مرزبانی بغدادی المتوفی ۳۸۴ھ کا کتب خانہ۔

پانچویں صدی ہجری:

۱- ابوذر عبد بن احمد بن محمد انصاری ہروی مالکی المعروف بابن السماک المتوفی ۴۳۴ھ کا کتب خانہ۔

۲- ابوحیان علی بن محمد توحیدی المتوفی ۴۰۰ھ کا کتب خانہ۔

مذکورہ بالا ائمۂ فن کے کتب خانوں کا تذکرہ ہم نے اپنے "تحقیقی مقالہ" اسلامی کتب خانے عہدِ عباسی میں" کیا ہے۔

اس دور میں (الف) مطالعہ (ب) تعلیم و تدریس (ج) تصنیف و تالیف (د) مناظرہ و مباحثہ (ہ) مذاکرہ (و) تفکر و تدبر اوہ اہم ذرائع تھے جن سے علوم زندہ رکھے جاتے اور ان میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ علماء استفادہ و افادہ کی خاطر اپنے آپ کو علمی سرگرمیوں میں وقف کیے رہتے تھے۔ اس لیے علوم ان کے دماغ میں تازہ رہتے تھے، وہ اپنی یافت و دریافت، معلومات و تحقیقات کو کتابوں میں منتقل کر کے موجودہ و آئندہ نسلوں کو اپنے علمی نتائج و ثمرات سے باخبر رکھتے اور ان موضوعات پر قدما سے جو یادگار مواد ہوتا، مقدمۂ کتاب میں اس کی نشاندہی کر کے قاری کو ان کتابوں سے متعارف کراتے۔ مزید تحقیقات کے لیے نئے راستوں کی طرف رہنمائی کرتے اور کتابی ذخائر کو فروغ دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کے صفحاتِ قلب و دماغ پر مسطور ہوتا تھا ان کا خزانۂ کتب انہی علوم و حقائق کا خارجی وجود تھا، چنانچہ حوادثِ روزگار یا ارضی و سماوی آفات سے ان کا ذخیرۂ کتب ضائع ہوجاتا تو اس کی ٹیس وہاں کے ہر مقامی کے دل میں اُٹھتی تھی۔ اس کا انہیں بھی طبعی غم ہوتا تھا،

لیکن ان کے صفحاتِ قلب پر وہ علوم و حکم نقش ہونے کی وجہ سے نہ ان کا دل بیٹھتا اور نہ وہ بیمار پڑتے تھے ، بلکہ ان علوم و معارف کا ہمہ وقت ذہن میں استحضار اور دل و دماغ پر ثبت رہنا ہی ان کے اطمینان کا سب سے بڑا سہارا تھا - انہیں اس امر کا یقین تھا کہ وہ جب چاہیں گے ان علوم و حکم کو پھر صفحاتِ قرطاس پر بآسانی اُتار دیں گے ۔
چنانچہ علماء و ادباء کے کتب خانے کسی وجہ سے نذرِ آتش کیے گئے تو انہوں نے جلانے والوں سے یہی کہا کہ تم نے ہمارا کتب خانہ جلا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا اس سے یہ سمجھنا کہ علم سے ہمارا رشتہ منقطع ہو گیا ، یہ درست نہیں - علمی ذخیرہ ہمارے دل و دماغ میں مسطور و محفوظ ہے - جن کی نظر سے ہماری تالیفات گذری ہیں ، ان کے مضامین اہلِ علم کے ذہنوں میں اُتر چکے ہیں - انہیں محو نہیں کیا جا سکتا ، چنانچہ وزیر کافی الکفاۃ ابوالقاسم اسماعیل بن عباد طالقانی المعروف بصاحب ابن عبّاد (۳۲۶ — ۳۸۵ھ = ۹۳۸ — ۹۹۵ م) نے ابو حیان علی بن محمد توحیدی (۰۰ — ۴۰۰ھ = ۰۰ — ۱۰۱۰ م) کو سال بھر قید میں رکھنے کے بعد جوشِ انتقام میں اس کا کتب خانہ نذرِ آتش کرا یا تو ابو حیان کو رنج ہوا اور اس نے اس ناروا حرکت پر اسے ملامت کی[1] لیکن آخر عمر میں جب اس نے اپنی تالیفات و علمی سرمایہ کو ناقدوں کے ہاتھوں میں جانے کے ڈر سے جلایا اور اس پر نکتہ چینی کی گئی تو اُس نے نکتہ چینوں سے کہا:

"میرے سینے میں وہ علم ہے جو کاغذ پر کاغذ بھرتا جائے گا اور زندگیاں ختم ہوتی رہیں گی ، لیکن وہ علم فنا نہیں ہو گا - یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر بڑا فضل ہے ، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے - میری آنکھ اس کے بعد سیاہی ، ورق ، جلد ، قرأت ، مقابلہ ، تصحیح اور نوشت و خواند سے نہیں تھکتی ہے"[2]

علامہ ابو محمد علی بن احمد المعروف با بن حزم قرطبی (۳۸۴ — ۴۵۶ھ = ۹۹۴ — ۱۰۶۴ م)

---

[1] یاقوت ، معجم الادباء ط: ۲ ، القاہرہ عیسی البابی الحلبی - ۱۳۵۷ھ ، جلد ۶ ص ۲۱۷ -
[2] ایضاً — جلد ۱۵ ص ۲۲۳ -

کی تصانیف کو جب اشبیلیہ میں نذر آتش کیا گیا[1] اور یہ خبر اسے پہنچی تو اس نے حسب ذیل شعر کہے تھے ۔

وان تحرقوا القرطاس لا تحرقوا الذی
تضمنہ القرطاس، بل ہو فی صدری

(اور تمہارا میری تصانیف جلا دینا دشود مند نہیں اس لیے کہ) ان مضامین کو جو کتابوں کے ذریعے ذہنوں میں اتر گئے ہیں، تم نہیں جلا سکتے ، نہ ان علوم کو جو میرے سینے میں محفوظ ہیں)۔

یسیرُ معی حیث استقلت رکائبی
وینزل ان انزل ویدفن فی قبری

(وہ علم میرے ساتھ چلتا ہے جہاں میری سواریاں جاتی ہیں اور جہاں میں اترتا ہوں وہاں اترتا ہے ۔ وہ میرے ساتھ قبر میں بھی دفن ہوگا)۔

دعونی من احراقِ رقٍ وکاغذٍ
وقولوا بعلم کی یری الناس من یدری[2]

(مجھے چھوڑو، چمڑے اور کاغذ کے جلانے سے باز رہو اور علم کی کہو تاکہ جو اہل علم دیکھیں وہ جان لیں)۔

ابو موسیٰ عبدالرحمٰن بن موسیٰ استیجی، امام مالک، سفیان بن عیینہ اور اصمعی جیسے ائمۂ فن کے شاگرد تھے۔ فقہ، حدیث، لغت و ادب کے امام و حافظ تھے ، موصوف نے اندلس سے مشرق کا سفر کیا ، کتابیں جمع کیں ، لے جاتے وقت وہ بحر تدمیر میں غرق ہوگئیں، جب استیجہ پہنچے تو لوگوں کو اس حادثۂ جانکاہ کا علم ہوا ۔ پورا شہر اس کی تعزیت کے لیے امنڈ آیا ۔ اہل استیجہ ان کی بخیر و عافیت واپسی پہ مبارک باد پیش کرتے

(باقی بر صفحہ ۵۷)

[1] یاقوت ، معجم الادباء جلد ۱۲ ص ۲۴۹ -
[2] ایضاً " ص ۲۵۳ -

مادّہ پرستانہ سائنس کی گواہی

تعلیماتِ قرآن کی صداقت پر

مرتبہ: آرتھر کومو - مترجم: عبد الہادی احمد (ادارۂ معارفِ اسلامی)

(۲)

آسٹریلیا میں ہمارے طریقِ تعلیم کو سرکاری طور پر لادینیت کے اُصول پر استوار کیا گیا ہے۔ اسے ہر نوع کی مذہبی عصبیت سے آزاد (SECULAR) قرار دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کنڈرگارٹن سے یونیورسٹی تک پورا نظامِ تعلیم ایک خدا دشمن اور شیطانی مذہب — "نظریۂ ارتقاء" سے لبریز ہے۔

اگر آپ ثانوی جماعت کے کسی طالب علم کو خدا کی شان میں کفر بکنے سے منع کریں (مجھے اس کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے) تو وہ آپ کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہے گا کہ خدا کہیں موجود نہیں ہے۔ اگر اس سے سوال کیا جائے کہ اس کے خیال میں زندگی، زمین اور کائنات کی موجودگی کا کیا جواز ہے، تو وہ آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرے گا کہ اسے سائنس میں جو کچھ پڑھایا گیا ہے وہی درست ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شے آپ سے آپ وجود میں آگئی۔ ابتدائے آفرینش کے بارے میں کوئی ایسا نظریہ قبول نہیں کیا جا سکتا جس سے قدرتِ الٰہی کا وجوب ہوتا ہو۔ اس کے بجائے نظامِ کائنات کو حرکت و زمان کے تعامل اور اتفاق کی کارستانی بتایا جاتا ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ طلبہ اپنے آپ کو بنی نوعِ انسان میں شمار کرنے کے بجائے محض ذی عقل حیوان سمجھنے لگتے ہیں۔

انھیں کسی اخلاقی قدر کا پاس نہیں رہتا، نہ وہ کسی کے حقوق ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح نہ برائی سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ کسی پرستش کرنے والی ان دیکھی ذات کا ان کے دل میں کچھ خوف باقی رہتا ہے۔

نظریہ ارتقاء کی تمام تر تدریس یقین کو تشکیک میں بدلنے کے لیے ہے۔ ہر نیا اصول پہلے سے زیادہ اُلجھنیں اور بے یقینی لے کر آتا ہے۔ وضاحت کا ہر دعویٰ زیادہ ظالمانہ اور شرمناک ہوتا ہے۔ کم از کم سکولوں کے طلبہ کو تو ارتقاء کی پوری کہانی سے جو حاصل ہوتا ہے، وہ صرف اور صرف خدا کے انکار پر مبنی عقلیت ہے۔

تخلیق پرست[۱] یقیناً ڈاکٹر فریڈ ہائل کے خیالات کی تشہیر سے مطمئن ہوں گے جو وہ حیاتِ ارضی کے آغاز کے بارے میں رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب "ذہینِ کائنات" (THE INTELLIGENT UNIVERSE) ارتقائی سائنس والوں کے سب سے بڑے مسئلے کا جواب پیش کرتی ہے۔

یہ قطعی ناممکنات میں سے ہے کہ کسی بے جان شے سے کوئی جاندار چیز جنم لے۔ سادہ سالموں کے ایک تصوراتی "شیرے" سے بلا سبب حیاتیاتی خلیات کیسے اُبھر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ہائل اس اتفاقی واقعے کو اس مثال کے ہم معنی قرار دیتے ہیں کہ بوئنگ ۷۴۷ کے منتشر ملبے سے ایک طوفانی بگولے کے ذریعے پھر سے جہاز بن جائے۔ یہ تو حقیقت کے منافی مگر مؤثر مطابقت ہے۔

ہائل کی طرح کچھ دوسرے لوگ بھی ایسے نظریات رکھتے ہیں۔ فرانسس کرک بھی ان میں سے ایک ہیں۔ وہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ اس زمین پر خلیے کا ظہور ناممکن الوقوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس کے ظہور کے لیے نامعلوم فاصلے پر واقع کہکشاں کی شرط عاید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صرف اسی مقام پر یہ غیرممکن امر ممکن ہوا۔

امریکی پروفیسر جان ٹیلر نے یہ کہہ کر نظریہ استقرار (THE ESTABLISHMENT

۱؎ کائنات کے خالق کو ماننے والے (CREATIONISTS)

کو درہم برہم کر دیا کہ اگرچہ کائنات میں ہمارے سورج کے نظام جیسے ۲۳ بڑے ستارے اور ان کی دُنیائیں موجود ہیں ۔ لیکن کسی بھی جگہ زندگی کا وجود نہیں ہے ۔ لہٰذا زندگی کے عدم امکان کی بنا پر بعین ممکن ہے کہ بے جان مادے سے دوبارہ جاندار خلیے جنم لے سکیں ۔ ڈاکٹر ہائل کہتے ہیں کہ استقرار کا نظریہ ان کے مفروضہ اصولوں کے لیے جھوٹا سہارا ہے ۔ اسی طرح پلٹ ڈاؤن مین (PILTDOWN MAN) پیکنگ مین (PEKING MAN) اور نبرسکا مین (NEBRASKA MAN) کے سامنے کیا گیا تھا ۔ مایوس لوگ نظریۂ ارتقاء کی حمایت میں سچی گواہی نہیں پاتے، لیکن آفرینش (CREATION) کے امکان کو بھی رد کرتے ہیں ۔ ایسے میں ان سے مایوس کن باتوں کی توقع ہی کی جا سکتی ہے ۔ وجود کائنات کے بارے میں آج سائنس کی سب سے بڑی شہادت اس نظریے کی تکذیب پر مبنی ہے، جس کی رُو سے کائنات عظیم تصادم (BIG BANG) کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے ۔ بے جان سے جاندار اشیاء کے وجود میں آنے کا سائنسی نظریہ بھی محل نظر ٹھہرایا جا رہا ہے اور بندر سے انسان تک کا ارتقائی نظریہ بھی اپنی آب و تاب کھو چکا ہے ۔ اس صورتِ حال میں ان نظریات کا معقول متبادل صرف یہ نظریہ ٹھہر سکتا ہے کہ یہ کائنات کسی منبع دانش خالق کی پیدا کردہ ہے ۔

مفروضہ نظریات سے آزادی اگر یہ ممکن ہوتا کہ انسان کو کائنات اور زندگی کے بارے میں پہلے سے قائم کردہ تمام نظریات سے آزاد کر دیا جائے ۔ اس کے بعد اس کے سامنے دو ماڈل پیش کیے جاتے ۔ ایک ماڈل آفرینش (SPECIAL CREATION) اور دوسرا عقل سے عاری نظریۂ ارتقاء کا، تو انسان یقیناً پہلے ماڈل کو پسند کرتا ۔ قدرت کے حق میں اور ارتقاء کے خلاف نہایت قوی دلائل موجود ہیں، لہٰذا کسی شخص کے ذہن سے ناکام نظریات کی جھوٹی تعلیمات کو کھرچنا چنداں دشوار نہیں ہے ۔ کائنات میں موجود لاکھوں خوردبینی چیزوں سے لے کر ایسی اشیاء تک، جنہیں خوردبینوں سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا ۔ پیچیدہ نظاموں کی ایسی حیران کن دُنیائیں ہیں جو انسانی عقل کو عاجز کر کے رکھ دیتی ہیں ۔ ایک طرف اگر ہر تصویر چیخ چیخ کر اپنے مصوّر کی موجودگی کا اعلان

کرتی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف "ارتقا پرست" اپنے اندھے امکان کے نظریے کے ساتھ ریں ریں کرتے نظر آتے ہیں۔

کائنات کتنی پرانی ہے؟ ہماری زمین اور ہمارے چاند کی عمر کتنی ہے؟ ارتقائی نظریات رکھنے والے سائنس دانوں کے نظریات اس بارے میں مختلف ہیں۔ کائنات کے بارے میں دس سے بیس ارب سال تک اور زمین اور چاند کے متعلق چار سے پانچ ارب سال تک۔ لیکن ان ہی جیسے علم و دانش سے بہرہ مند کچھ سائنسدان ایسے بھی ہیں جو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور باقاعدہ دلائل سے ثابت کر رہے ہیں کہ کائناتِ ارض و سما کی عمر دس ہزار برس سے زیادہ نہیں ہے۔

بے یقینی ایک منکرِ خدا انسان جو ایک زندہ اور محبت کرنے والے خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا، کہتا ہے کہ ہماری موجودہ کائنات ایک بہت بڑے حادثے کے نتیجے میں ظہور میں آئی ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب توانائی کے ایک بہت بڑے ذخیرے کا ایک چھوٹے سے علاقے میں ارتکاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں تمام مادہ وجود میں آیا جسے بعد میں باہر دھکیل دیا گیا۔ بعد ازاں اسی مادے سے تمام کہکشائیں، ستارے اور آخرکار ہم انسانوں نے جنم لیا۔

بی بی سی کے ایک حالیہ سائنسی پروگرام "بے تناقض دنیا" میں یہ نقطہ اٹھایا گیا کہ جب توانائی کی بہت بڑی مقدار ایک چھوٹے سے مقام پر مرتکز ہوئی تو اس سے مادی اور ضد مادہ اشیا برابر مقدار میں پیدا ہوگئیں۔ یہ "ضد مادہ" کیا ہے۔ یہ آئینے میں نظر آنے والی شکل کی طرح کا مادے کا عکس ہوتا ہے، لیکن اگر ضد مادہ ذرہ اپنے متماثل مادی ذرے سے ٹکرا جائے تو نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ریڈی ایشن کے سبب ان کی تمام توانائی (روشنی اور حرارت کی شکل میں) ختم ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر کائنات کے عظیم اتفاقی حادثے کے نظریے کا بودا پن خود بخود آشکارا ہو جاتا ہے۔

نظریہ ارتقا کا ایک ناقابلِ حل مسئلہ منقطع رابطے کی دوہری مشکل ہے۔ زمین کی تہوں سے برآمد ہونے آثار پر انحصار نظریے کو تقویت پہنچانے کے بجائے کمزور

کرتا ہے۔ تغیرات کے عمل (جیسے مچھلی سے جل مچھلیے تک) کا تقاضا تو یہ ہے کہ نظامِ تنفس، تناسل اور نقل و حمل کے نظاموں میں بے پناہ تبدیلیاں ہوں۔ اس کے برعکس ناقابلِ یقین تبدیلیاں بتدریج ہونے کے بجائے یا تو دفعتہً ہو جاتی ہیں یا غیر ضروری اور معمولی تبدیلی کے علاوہ چیزوں کی ماہیت تبدیل نہیں ہوتی۔ ارتقاء کے نظریے کی رو سے یہ کسی طور باقی نہیں رہنی چاہئیں۔ آخر پھیپھڑوں کے جوڑے کا نصف یا ٹانگوں کی محض ایک سمت کسی مخلوق کو کیا کام دے سکتی ہے؟

ناممکن امکانات | سادہ اور تنہا خلیے کو لیجیے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود بخود وجود میں آ گیا اور تاریخِ کائنات کے آغاز میں چند کیمیاوی مرکبات کے شیرہ نما آمیزے نے بالائے بنفشی روشنی میں غسل کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک پیچیدہ کیمیاوی مواد ایک سادہ زندگی رکھنے والے انسان کے قالب میں ڈھل گیا۔ اگرچہ اسے بھی جزوی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

سر فرانسس کرک جنھوں نے ڈی این اے خلیے کی دریافت میں حصہ لیا اور نوبل پرائز حاصل کیا، ارتقاء کے نظریے کے پُر جوش حامی ہیں۔ اُن کا اِصرار ہے کہ:

"زندگی کی نمو اس دُنیا پر کبھی نہیں ہوئی۔ یہ قطعی طور پر بیرونی فضائے بسیط سے آئی ہے"۔

مشہور برطانوی ماہرِ فلکیات سر فریڈ ہائل نے زندگی کے خود بخود عدم سے وجود میں آنے کے نظریات کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا امکان اتنا ہی ہے جتنا کسی غیر جانب دار پانسے کے بغیر ہی مسلسل پانچ ملین چھکے پھینکنا، بالفاظِ دیگر قطعی ناممکن ہے۔ ہائل کہتے ہیں:

"زندگی ہمارے ہاں بیرونی فضا سے ہی آسکتی ہے"۔

شاید آپ نے سائنس دانوں کی ٹسٹ ٹیوب میں جامد کیمیاوی مرکبات کے ملاپ سے زندہ خلیے پیدا کرنے کی کہانیاں سُنی ہوں گی۔ ذرا ایسی کہانیوں کی تفصیل میں جائیں۔ کبھی ایسا ممکن نہیں ہو سکا کہ کائنات پر حیاتیاتی آغاز کے ارتقائی اُصول پر، لیبارٹری میں کسی زندگی نے

جنم لیا ہو۔ ارتقاء کے حامی نظریات کی خوش رنگ بھول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے اور گم کردہ راہ ہیں۔ جب آپ خدا کو نکال باہر کریں گے تو آپ کو لازماً "اندھے امکان" اور "مددگار تغیرات" جیسے نظریات پر مذہبی انداز کا عقیدہ رکھنا پڑے گا۔

۱۹۷۳ء میں برطانیہ کے ثانوی سکولوں کے نصاب میں رابرٹ آرڈرے کی کتاب THE TERRITORIAL IMPERATIVE شامل تھی۔ اس کتاب میں آرڈرے نے ایک چھوٹے سے جاندار کی مثال پیش کی ہے۔ جیسے کسی "ارتقائی امکان" نے خصوصی معطر غدود "عطا" کر دیئے ہیں۔ اس مخلوق کے غدود میں A... کے خلیوں کے بارے میں یہ تفاصیل دی گئی ہیں:

ا۔ غدود کا سائز، شکل اور مقام وقوع۔
ب۔ پٹھے اور دوسرا خلیاتی ڈھانچہ۔
ج۔ غدود کو خون کی ترسیل۔
د۔ دوسرے غدود سے اندرونی رابطہ۔
ر۔ جاندار کے دماغ سے منسلک نسیں۔
س۔ دماغ کی مخصوص وائرنگ۔

تم جو بارھویں جماعت کے طالب علم ہو، اس کی صراحت کے لیے تمہیں [illegible] معلومات کے کتنے ٹکڑے درکار ہوں گے؟ ایک ملین — دو ملین؟ ..... دس ملین؟ ان مکمل معلومات کے بغیر محض چند چھوٹے ریزوں سے اس مخلوق کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک حصے کو چھوڑ دو گے تو باقی کیا رہ جائے گا — نظریۂ ارتقاء کے لیے نامکمل گواہی یا قدرتِ الٰہی کی واضح شہادت؟

ارتقاء غیر سائنسی ہے

تب ارتقاء کا کیا مطلب نکلا؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نسل کشی کے مخصوص طریقوں سے کتے، بلی، کینری اور گائے وغیرہ کی جسامت، شکل اور رنگ تبدیل کر سکتے ہیں، لیکن ہم ان کو ایک سے دوسری نسل میں تبدیل نہیں کر سکتے اور نہ ہی نظریۂ ارتقاء کی کوئی مفروضہ تصویر ہی ایسا کر سکتی ہے۔ ارتقاء کو سائنسی ہونے

کا دعوٰی تو کبھی نہیں ہوا۔ نہ تو اس کی نمائش کی جاسکتی ہے اور نہ اسے دہرایا جاسکتا ہے۔

جن لوگوں کے لیے ایک عاقل اور خود مختار خالق کا تصور ناپسندیدہ نہ ہو، بلکہ اس سے ان کے جذبوں کو مہمیز لگتی اور سکون حاصل ہوتا ہو، اُن کے لیے آغازِ حیات کے سوال کا بہترین جواب کتابِ پیدائش کے باب اوّل میں موجود ہے جو یوں شروع ہوتا ہے۔

"ابتدائے آفرینش میں خدا نے پیدا کیا..." [۱]

اساتذہ طلبہ کو ارتقا کا جھوٹا مذہب پڑھا رہے ہیں اور اس طرح ان میں ایک خدا دشمن رجحان اور طریقِ زندگی کی پرورش کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو خلاقِ عالم کی تخلیقی نیرنگیوں کی تعلیم سے بہرہ ور کریں۔ انہیں بتائیں کہ خدا موجود ہے اور سب سے محبت کرتا ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ خدا کے انکار اور اس کے حکم کو نہ ماننے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔

(بشکریہ "دی یونیورسل میسیج")

---

[۱] قرآنِ پاک میں تخلیقِ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں کہیں زیادہ وضاحت اور صراحت موجود ہے۔

اطلاع عام

ماہنامہ ترجمان القرآن، بتول، نور، الحسنات، ہفت روزہ ایشیا اور آئین خریدنے کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائیں یا ٹیلیفون نمبر ۴۲۵۰ ۷ پر رابطہ قائم کریں۔

نوٹ: مذکورہ بالا رسائل گھر پر پہنچانے کا خاطر خواہ انتظام ہے۔

چودھری محمد ایوب۔ ناظم تحریک اسلامی جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اسلام میں سیاسی جماعتوں کا وجود اور مولانا مودودیؒ

نور الٰہی ایڈووکیٹ - گجرات

اِن دنوں جماعتی یا غیر جماعتی انتخابات کی بحث چل رہی ہے۔ اہلِ حل و عقد اور اصحابِ فکر و نظر اپنے اپنے نظریات کے حق میں دلائل مہیا کر رہے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف سیاسی مسائل پر وقتاً فوقتاً روشنی ڈالی ہے۔ اِس ضمن میں سیاسی اور دینی جماعتوں کے بارے میں مولانا مرحوم کے نظریات درج ذیل ہیں:-

۲ شعبان ۱۳۶۰ھ کو جماعتِ اسلامی کی تاسیس کے موقع پر اپنی تمہیدی تقریر میں مولانا نے فرمایا:

"خوب سمجھ لیجئے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبیؐ کی قیادت میں بنتی ہے بلکہ ہماری حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظامِ جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبیؐ کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے مگر بعد میں اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لئے جو لوگ اٹھیں ضروری نہیں کہ ان سب کی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیر المومنین ہے۔"

روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل صفحہ ۱۴، ۱۵

۳۔ شعبان کو اپنے خطاب میں مولانا نے مزید فرمایا:

"جو لوگ ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مسلک رکھتے ہوں ان کے لئے ایک جماعت بن جانے کے سوا چارہ نہیں اور ان کا ایک جماعت بن جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ وحدتِ کلمہ کا لازمی نتیجہ وحدتِ اجتماع ہے۔" (رودادِ جماعت اسلامی حصہ اول ص۱۲)

اسلام بلا جماعت کے بارے میں کسی نے مولانا مرحوم سے یہ استفسار کیا کہ جو شخص آپ کی جماعت کے اصولوں کے مطابق اپنی جگہ حتی المقدور صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہا ہو وہ اگر بعض اسباب کے ماتحت باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

"اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے کہ جو احادیث سے ثابت ہے کہ صحیح اسلامی زندگی جماعت کے بغیر نہیں ہوتی۔ زندگی کے صحیح اسلامی زندگی ہونے کے لئے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین (اقامتِ دینِ حق) سے وابستگی ہے۔ اس وابستگی کا تقاضا ہے کہ آدمی نصب العین کے لئے جدوجہد کرے اور جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی، لہذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ہماری اس جماعت میں شامل نہ ہو اور کسی اور ایسی جماعت سے اس کا تعلق ہو جو یہی نصب العین رکھتی ہو اور جس کا نظامِ جماعت اور طریقِ جدوجہد بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ اس صورتحال میں ہم اس کو برسرِ ہدایت ماننے میں کوئی تامل نہیں کرتے، لیکن یہ بات ہمارے لئے صحیح نہیں ہے کہ آدمی صرف ان طریقوں کی پابندی پر اکتفا کرتا رہے جو شخصی کردار کے لئے شریعت میں بتائے گئے ہیں اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے کسی جماعت سے وابستہ نہ ہو، ہم ایسی زندگی کو کم از کم نیم جاہلیت کی زندگی سمجھتے ہیں۔ ہمارے علم میں اسلامیات کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گرد و پیش ایسی کوئی جماعت نظر نہ آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی نصب العین کے لئے اسلامی طریقہ پر سعی کرنے والی ہو، تو اسے سچے دل سے ایسی جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جب کبھی ایسی

جماعت پائی جائے وہ اپنی انانیت چھوڑ کر ٹھیک ٹھیک جماعتی ذہنیت کے ساتھ اس میں شامل ہو جائے۔" (رسائل ومسائل حصہ اول صفحہ ۴۰۸، ۴۰۹)

کسی صاحب نے ایک عالمِ دین کے حوالہ سے اقامتِ دین اور نظمِ جماعت کے بارے میں مولانا مودودیؒ سے استفسار کیا اور ایک دیگر بزرگ کا یہ بیان نقل کیا" کہ اسلامی دستور کی تشکیل کے بعد پاکستان ایک اسلامی ریاست بن چکا ہے اور یہاں تمام مسلمان شہری ایک نظامِ اطاعت میں منسلک ہو چکے ہیں اور یہ نظامِ اطاعت سب کو جامع اور سب پر فائق ہے۔ اب سب کی اطاعتیں اس بڑے نظامِ اطاعت کے گرد جمع ہو چکی ہیں لہٰذا اس کی موجودگی میں کسی اور نظم کا قیام اور افراد سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حکومت کے اندر ایک متوازی حکومت قائم کرنا۔ خلاصہ یہ کہ اب کسی جماعت کسی تنظیم اور کسی امیر کی ضرورت نہیں ہے پاکستان کی ایک اسلامی ریاست ہے حکومت اس کا تنظیمی مظہر ہے۔ تمام مسلمان شہری اب کسی جماعت کے نہیں، بلکہ اس ریاست کی ہمہ گیر تنظیم کے رکن ہیں اور اب ان کی تمام اطاعتیں اور وفاداریاں اسی تنظیم کا حق ہیں۔ نہ کہ کسی اور جماعت کا۔ اب اطاعت کسی اور کی نہیں، بلکہ ریاست کے صدر کی ہونی چاہیے۔" یہ بیان نقل کرنے کے بعد سائل نے لکھا کہ وہ طرزِ استدلال ہے کہ اس کے نتیجہ میں شہریوں کا حق انجمن سازی (RIGHT TO FORM ASSOCIATION) ہی ختم ہو جاتا ہے اور نہ صرف ختم ہو جاتا ہے، بلکہ اس کا ذکر کرنا بھی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے مترادف ہے چنانچہ سائل نے مولانا سے استفسار کیا کہ آپ کے پاس اس استدلال کا کیا جواب ہے؟

اس سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

" رہا نظمِ جماعت تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ احکامِ کفر کے مقابلہ میں احکامِ الٰہی کے اجراء کی کوشش بہرحال منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود اور جو جماعت موجود ہو۔ اس کا التزام ضروری ہے۔ اس مضمون پر کثیر التعداد احادیث دلالت کرتی ہیں۔ البتہ جہاں تمام اہلِ ایمان کی ایک

جماعت موجود نہ ہو اور اس مقصدِ عظیم کے لئے اجتماعی قوت پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہوں تو التزامِ جماعت کے ان احکام کا اطلاق تو نہ ہوگا جو الجماعت کی موجودگی میں شارع ؑ نے دیئے ہیں، لیکن کوئی ایسا شخص جو اقامتِ دین کے معاملے کی شرعی اہمیت سے واقف ہو اور اس معاملہ میں ایک مومن کے فرض کا احساس رکھتا ہو ان کوششوں کے ساتھ بے پروائی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ان کا جائزہ لے اور جس کوشش کے بھی صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو جائے اس میں خود بھی حصہ لے۔ پھر حصہ لینے کی صورت میں (یعنی جب کہ آدمی ایک جماعت کو برحق جان کر اس سے وابستہ ہو چکا ہو) نظم و اطاعت کا التزام نہ کرنا سراسر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ اطاعت محض نفل نہیں بلکہ فرض ہے کیونکہ اس کے بغیر فریضۂ اقامتِ دین عملاً ادا نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں اطاعتِ امر کے جو احکام آئے ہیں اور خود قرآن میں اطاعت اولوالامر کا جو فرمان خداوندی آیا ہے ان کے متعلق یہ سمجھنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ احکام صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کے لئے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اب نہ کوئی اسلامی حکومت چل سکتی ہے اور نہ کبھی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے کیونکہ نظام کی پابندی اور سمع و طاعت کے بغیر ان چیزوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

"دوسرے جن صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کی عقل نے وہ نکتہ پیدا کیا ہے جو ابھی تک موجودہ امراء المومنین کو بھی نہیں سوجھا ہے۔ اگر یہ بات انہیں سوجھ جائے تو ملک کی تمام جماعتوں کو بیک جنبشِ قلم ختم کر کے ہمیشہ کے لئے ہر اس شخص کا منہ بند کر دیں جو یہاں احکامِ اسلامی کے اجراء کا نام لے اور پھر یہاں صرف رقص و سرود اور فسق و فجور ہی ہوتا رہے۔ اس کے بعد تو یہاں اطمینان کے ساتھ انگریزی دور کے قوانین چلتے رہیں گے اور شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کرنے والے دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی سیہ رو اور مستحقِ عذاب ٹھہریں گے کیونکہ شرعاً وہ نفاذِ شریعت کی سعی کرنے کے مجاز ہی نہ ہوں گے۔" (رسائل و مسائل حصہ چہارم۔ ص ۳۴۶ - ۳۴۷)

اسی سلسلے میں مولانا نے مزید فرمایا:

" اسلامی ریاست کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار سے ہی اسلامی نہ ہو، بلکہ عملاً حکومت بھی اسلامی ہو، صالح اور متقی اہلِ ایمان اس کو چلا رہے ہوں، شوریٰ کا نظام اپنی حقیقی اسلامی روح کے ساتھ قائم ہو اور پورا انتظامِ حکومت ان عقائد کے لئے کام کر رہا ہو جن کی خاطر اسلام اپنی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں ریاست کا صدر ہی تمام اہلِ ایمان کا لیڈر ہوگا اور اس کی قیادت میں تمام اہلِ ایمان ایک جماعت ہوں گے۔ اس وقت جماعت کے اندر جماعت بنانے کی ہر کوشش غلط ہوگی اور ایک امام کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت یا بیعت کا کوئی جواز نہ ہوگا۔

دوسری حالت وہ ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار سے اسلامی ہو، باقی خصوصیات اس میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اس حالت کے مختلف مدارج ہیں اور ہر درجے کے احکام الگ ہیں۔ بہرحال ایسی حالت میں اصلاح کے لئے منظم اجتماعی کوشش کرنا ناجائز تو کسی طرح نہیں ہے اور بعض صورتوں میں ایسا کرنا فرض بھی ہو جاتا ہے۔ اسے ناجائز قرار دینے کا خیال اسلامی ریاست کے فاسق حکمران کریں تو کریں، لیکن یہ عجیب بات ہوگی کہ اس کے صالح شہری بھی اسے ناجائز مان لیں۔ درآنحالاکہ اس کے عدم جواز کی کوئی شرعی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ناجائز ہو تو آخر ان ائمہ مجتہدین کا کیا مقام قرار پائے گا جنہوں نے بنو امیہ کے خلاف اٹھنے والوں کی خفیہ اور علانیہ تائید کی؟"

(رسائل و مسائل جلد چہارم صفحہ ۳۴۸ ۔ ۳۴۹)

آزادیٔ اظہار رائے کے بارے میں مولانا نے فرمایا:

" ایک اور اہم چیز جسے آج کے زمانہ میں آزادیٔ اظہار رائے FREEDOM OF EXPRESSION کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے دوسری زبان میں بیان کرتا ہے، مگر

دیکھیے مقابلتہً قرآن کا کتنا بلند تصور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف انسان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ قرآن کی رو سے بھی اور حدیث کی ہدایات کے مطابق بھی۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لئے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہو تو صرف یہی نہیں کہ بس اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ اس کے انسداد کی کوشش بھی فرض ہے۔ اور اگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی تو الٹا گناہ ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔ اگر اس معاملے میں مسلمان کی آواز بند کی جائے تو اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے بھلائی کے فروغ کو روکا تو اس نے نہ صرف ایک بنیادی حق سلب کیا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی سے روکا۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو ہر حالت میں یہ حق حاصل رہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ [1] (وہ برائیوں سے ایک دوسرے کو باز نہ رکھتے تھے) یعنی کسی قوم میں اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں کہ برائی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہو تو آخر کار رفتہ رفتہ برائی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے اور وہ پھلوں کے سڑے ہوئے ٹوکرے کے مانند ہوتی ہے جس کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس قوم کے عذاب الٰہی کے مستحق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔"

(اسلامی ریاست: صفحہ ۵۶۶ - ۵۶۷)

نیز آزادیٔ اجتماع کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

"آزادیٔ اظہار کے عین منطقی نتیجے کے طور پر آزادیٔ اجتماع کا حق نمودار ہوتا ہے۔ جب اختلافِ آراء کو انسانی زندگی کی ایک حقیقت کے طور پر قرآن نے بار بار پیش کیا ہے تو پھر اس امر کی روک تھام کہاں ممکن ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے

[1] - المائدہ ۷۹

لوگ آپس میں مربوط ہوں۔ ایک اصول اور نظریے پر مجتمع ہونے والی ملت کے اندر بھی مختلف مدارسِ فکر ہو سکتے ہیں اور ان کے متوسلین بہرحال باہم وگر قریب تر ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴)

"اور تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔"

عملی زندگی میں جب "خیر" "معروف" اور "منکر" کے تفصیلی تصورات میں فرق واقع ہوتا ہے تو ملت کی اصولی وحدت کے قائم رہتے ہوئے بھی اس کے اندر مختلف مدارسِ فکر تشکیل پاتے ہیں اور یہ بات معیار مطلوب سے کتنی بھی فروتر ہو، گروہوں اور پارٹیوں کا ظہور ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کلام میں بھی، فقہ و قانون میں بھی اور سیاسی نظریات میں بھی اختلاف آراء ہوا اور اس کے ساتھ مختلف گروہ وجود میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی دستور اور منشور حقوق کے لحاظ سے کیا مختلف اختلافی آراء رکھنے والوں کے لئے آزادیٔ اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علیؓ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور آنجنابؓ نے ان کے لئے آزادیٔ اجتماع کے حق کو تسلیم کیا، انہوں نے خارجیوں سے فرمایا "جب تک تم تلوار اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔"

(اسلامی ریاست: صفحہ ۵۶۸ - ۵۶۹)

نوٹ: اس مسئلے پر مزید مفصل بحث کے لئے مولانا کا رسالہ "شہادتِ حق" بھی ملاحظہ فرمایا جائے۔

مُسلم پاکستانی خواتین کے لیے

سیرتِ رسولؐ کا پیغام

محترمہ شاہدہ سمیع صاحبہ - کراچی

(یہ مقالہ خواتین کی سیرت کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا - مقالہ نگار کانفرنس میں نہ جا سکیں، اب ان کی یہ کاوش ترجمان القرآن میں پیش کی جا رہی ہے)

یوں تو خواتین ہمیشہ ہی موضوعِ بحث رہی ہیں لیکن آج کل کچھ زیادہ ہیں۔ دُنیا کی توجہ بھی اس طرف زیادہ ہے۔ چند سال قبل خواتین کا عالمی سال منایا گیا۔ ہمارے ملک میں بھی اسلام کے حوالے سے خواتین کے حقوق کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ شہادت اور دیت کے مسائل پر بحث میں فکر و ذہن کا اختلاف سامنے آ رہا ہے اور اس کے باوجود کہ ہر فریق حوالہ کتاب و سنت کا دیتا ہے، نتائج میں اختلاف ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بعض خواتین، جو بہرحال مسلمان شمار ہوتی ہیں پاکستان کی مسلم خواتین کو غیر مسلموں کے ساتھ شمار کر وا کے پچپن فی صد کی بنیاد پر حقوق طلب کر رہی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال میں ایک مسلمان خاتون کیا کرے؟ آخری رسولؐ کی اُمت ہونے کی حیثیت سے سیرتِ رسولؐ کے تقاضے کس طرح پورا کرے؟ اگر وہ خود نیک ہو، پابندِ صوم و صلوٰۃ ہو، شعائرِ اسلامی کا احترام

کرے اور حجاب وحیا کی حدود کا خیال رکھے تو کیا ان سے دین کے دوسرے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے)

تو کیا اللہ کے رسولؐ نے فرد کے نیک ہونے پر اکتفا کیا؟ اگر آپ نے ایسا کیا ہوتا تو آج ہم بھی صرف خود نیک بن کر سیرتِ رسولؐ کے تقاضے پورا کر سکتے تھے لیکن یقیناً آپ نے اس طرح نہیں کیا، بلکہ سیرتِ رسولؐ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ آپؐ نے زندگی کا لمحہ لمحہ اللہ کی طرف بلانے اور اس کا پیغام پہنچانے میں صرف کیا۔ اپنے عمل اور قول سے آپ نے گواہی دی اور حجۃ الوداع میں حاضرین سے پوچھ کر اس کی تصدیق کی کہ آپؐ نے حقِ شہادت ادا کر دیا۔ آپؐ خاتم النبیینؐ تھے اور آپؐ کے بعد آپؐ کی اُمت پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ خدا کا پیغام رہتی دنیا تک پہنچاتی رہے۔ اس طرح اب ایسا میکنزم بنا دیا گیا ہے کہ ہر دَور میں اور ہر طرح کے حالات میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ اور احیائے اسلام کے تقاضے پورا کرتا رہے۔

ہر دَور میں دعوت الی اللہ کا فریضہ، بنیادی دعوت کو برقرار رکھتے ہوئے، اُس دَور کے تقاضوں اور طریقوں کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ یہ فریضہ انجام دینے والے حالات اور اردگرد کے ماحول سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ اگر خدا کا پیغام صحیح انداز سے بہترین طریقۂ کار اختیار کر کے اور جدید ترین وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ پہنچایا جائے اور اس وجہ سے دعوت نہ پھیلے تو قصور دعوت قبول نہ کرنے والوں سے زیادہ دعوت کو مناسب طور پر پیش نہ کرنے والوں کا ہے۔

یہ متعین کر لینے کے بعد سیرتِ رسولؐ کا تقاضا صرف یہ نہیں ہے کہ خود ہی نیک بن کر بیٹھ جایا جائے، بلکہ اسوۂ رسولؐ کے اتباع میں دوسروں کو نیک بنانے کے لیے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینا بھی اس کا تقاضا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ایک مسلمان پاکستانی خاتون یہ فریضہ کس طرح انجام دے۔ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

(اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ)

حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسی وقت ممکن ہے جب پیش منظر کا صحیح ادراک موجود ہو تب ہی صحیح حکمتِ عملی بنائی جا سکتی ہے۔

اس مضمون میں اسی کے مطالعہ کی ایک کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ پاکستانی معاشرہ میں خواتین کس صورتِ حال سے دوچار ہیں؟ اس صورتِ حال کا ایک پیمانہ تو ٹی۔ وی کی ڈرامہ سیریز دیواریں اور جنگل وغیرہ کی حیرت انگیز مقبولیت اور ان کے بارے میں اس عام تاثر کا پایا جانا ہے کہ یہ افسانے نہیں ہیں بلکہ حقیقتِ حال کا بیان ہے اور اس طرح ان ڈراموں سے دراصل ہمارے معاشرے میں عورت کی جو حیثیت ہے، وہ ظاہر ہو گئی ہے۔ ایک عام پاکستانی کے لیے یہ احساس کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس کے ملک میں عورت پر کیا گزر رہی ہے، وہ کس طرح مجبور اور مظلوم ہے۔ اپنے ہی بارے میں فیصلوں کے معاملے میں کس طرح بالکل بے بس ہے اور اپنے انسانی حقوق سے بالکل محروم ہے۔

ایک دوسرا پیمانہ خواندگی کے اعداد و شمار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو ہمارے معاشرے میں جہالت زیادہ ہے لیکن خواتین بطورِ خاص جاہل رکھی جاتی ہیں۔ دیہی علاقوں کی خواتین میں دو تین فیصد خواندگی ہے اور یہی آبادی ہمارے ملک کی اکثریت ہے۔ اس کے اثرات قومی زندگی پر لازماً پڑتے ہیں۔

ایک محدود لیکن مؤثر اقلیت ان خواتین کی بھی ہے جنہوں نے کالجوں میں تعلیم پائی لیکن اس تعلیم کے ساتھ انہوں نے مغربی اندازِ فکر اور طرزِ معاشرت کو اپنایا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی مذہبی اور مشرقی اقدار کو ترک کر کے مغرب کی اقدار کو زیادہ برتر اور بہتر سمجھتے ہوئے اختیار کیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے مغرب کے پیچھے چل رہی ہیں اور آنکھیں کھول کر یہ دیکھنے کو بھی تیار نہیں کہ خود مغربی معاشرہ میں عورت کا کیا حشر ہو چکا ہے۔

میرے خیال سے حکمت اور موعظہ حسنہ کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے معاشرے میں ان تمام خواتین تک اسلام کا وہ انقلاب آفرین پیغام پہنچایا جائے جو ان کو بے بسی اور محرومی سے نجات دے اور سکون، اطمینان اور چین سے مالا مال کرے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ خواتین تک خواتین کے ذریعے پیغام پہنچے۔ یہ بات کہہ کر اس امر کی نفی نہیں کی جا رہی ہے کہ فطری طور پر عام معاشرتی دائرہ میں جو روابط خواتین اور مردوں کے ہیں ان کے ذریعے یہ کام نہیں ہو سکتا یا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس دور کے ایک تقاضے کے طور پر یہ بات پیش کی جا رہی ہے کہ اگر خود خواتین اپنے فرائض پہچانیں تو خود ان کے ذریعے زیادہ مؤثر طور پر اسلام کا پیغام خواتین تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں خواتین میں دعوت الی اللہ کی کامیابی کے لیے ضروری یہ ہے کہ اسلام نے خواتین کو جو حقوق دیئے ہیں اور جن کا بیان برابر ہوتا رہتا ہے، ان کے حصول کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جائیں کہ وہ حقوق اس ملک کی ہر خاتون شہری کو فی الواقعہ مل جائیں۔ یہ کام محض خواہشات سے اور دعاؤں سے اور نیک تمناؤں سے ہونے والا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک ایسی جدوجہد کی ضرورت ہے جس میں خود خواتین کو فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک طرف خواتین میں ان کے اسلامی حقوق کا شعور پیدا کرنا ہوگا کہ اس کے بغیر جدوجہد کا آغاز ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے دیگر طبقات یعنی مردوں کی اور برسرِ اقتدار حکومت کو بھی اس طرف توجہ دلانی ہوگی کہ جب وہ اسلام کا نام لیتے ہیں، اس کے نفاذ کے دعوے کرتے ہیں تو عورتوں کو ان کے اسلامی حقوق سے کیوں محروم رکھتے ہیں؟

ہمارے ملک میں جو خواتین سیرتِ رسولؐ کا شعور رکھتی ہیں اور اس کے تقاضے پورا کرنا چاہتی ہیں ان کو درج ذیل اہم کام کرنا چاہییں اور یہ کام ایک مہم کے طور پر شروع کرنا چاہییے:-

وہ خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کا کام ہے۔ اس راہ میں جو مشکلات اور موانعات ہیں ان کا صحیح اندازہ کر کے ان کا مقابلہ کرنا اور ان پر قابو پانا چاہیے۔ آج کے دور میں اتنی ایجادات ہو چکی ہیں کہ ان کو استعمال کر کے تعلیم عام کرنے کا کام مؤثر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا تو جاتا ہے کہ ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ کہنے کے باوجود تعلیم کے لحاظ سے سب زیادہ لاپروائی کا شکار ہماری خواتین ہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس سے صرفِ نظر کر لیجیے کہ موجودہ تعلیم کتنی اسلامی ہے لیکن جیسی کچھ بھی یہ تعلیم ہے وہ کتنی بچیوں کو مل رہی ہے۔ ہماری خواتین ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہالت اور بے بسی کا ایک سمندر ہیں، جن میں کہیں کہیں تعلیم یافتہ خواتین کے جزیرے موجود ہیں۔ جو بھی اس ملک کی خواتین میں دعوت الی اللہ کو عام کرنا چاہتا ہے اور خواتین میں ان کے حقوق اور فرائض کا شعور بیدار کرنا چاہتا ہے اس کو تعلیم کے مؤثر ترین ہتھیار کو استعمال کرنا ہوگا۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ بنیادی تعلیم کے بغیر آج کے دور میں کس طرح کوئی عورت سیرتِ رسولؐ سے واقف ہوسکتی ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر آمادہ ہوسکتی ہے۔

تعلیم کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ابتدائی ضروری تعلیم کے لیے ایسی کتابیں، قاعدے، کیسٹ اور وڈیو کیسٹ تیار کیے جائیں جن کے ذریعے حروف شناسی اور معمولی جملوں کے ساتھ ہی دین کے تصورات کا بھی زیرِ تعلیم فرد تک ابلاغ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ یہ دین ان سے روزمرہ کے عملی دائرہ میں کس طرح کی زندگی کا تقاضا کرتا ہے، جس کے لیے ہمیں اپنی موجودہ زندگی میں ایک اچھی تبدیلی لانی ہوگی۔ ایسی تعلیم کے ساتھ ساتھ خوشگوار تبدیلی کا عمل اپنے آپ شروع ہوگا۔ اور ظلم و جبر اور بے بسی کی زنجیریں کٹیں گی اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ ہماری خواتین عموماً اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے بہرہ ور ہوں گی۔

سیرتِ رسولؐ کا پیغام آج کے دور میں ایک مسلمان پاکستانی خاتون کے لیے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اس ملک میں ایک ایسا معاشرہ برپا کرے جس میں عورتوں

کو ان کے وہ سب حقوق ملیں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے اُن کو دیئے ہیں۔ اسی پیغام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مغرب کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ کر کے جھوٹے حقوق کی اس دوڑ میں نہ لگ جائیں جس کے نتیجہ میں عورت کا وجود خود اس کی اپنی نظر میں کوئی باعزت وجود نہیں ہوتا۔ اسلام نے، جو اس خالقِ کائنات کا دیا ہوا دین ہے جس نے مرد اور عورت دونوں کو پیدا کیا، دونوں کے حقوق اور فرائض اُن کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق بیان کر دیئے ہیں۔ انسانی تہذیبوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انسان نے اس سے منہ موڑا ہے وہ تباہی کے گڑھے میں گرا ہے۔ افراط و تفریط دونوں ہی مطلوب نہیں۔ اعتدال اور توازن ہی زندگیوں میں وہ حُسن پیدا کر سکتا ہے جو مطلوب ہے۔ آج کے پاکستانی معاشرے میں عورت پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کا صحیح ادراک کیا جانا چاہیے۔ اس کے مسائل کا صحیح مطالعہ ہونا چاہیے۔ جن مشکلات کی وہ شکار ہے اُس کا احساس کرنا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ ان مشکلات اور مسائل سے نجات پانے کے لیے اسلام نے کیا راہ عمل دی ہے۔ اس راہِ عمل کو پہچاننا، اس پر چلنا اور اسے ایک شاہراہ کے طور پر اس ملک کی ہر عورت کے سامنے پیش کرنا ہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کے لیے معاشرے کے ہر طبقہ کو اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا اور خواتین کو درجِ بالا نکات کی روشنی میں لائحہ عمل ترتیب دینا چاہیے۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

رسائل و مسائل

کیا عورتوں کو لکھنا سکھانا منع ہے؟

سوال :- ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں - ہمارے امام مسجد صاحب جو کہ مکتبہ بریلوی سے تعلق رکھتے ہیں - جمعیت علمائے پاکستان کے حامی ہیں، تعلیمِ نسواں سے متعلق اپنے اکابرین کی کتب سے مندرجہ ذیل حوالہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے نشر کرتے رہتے ہیں - مہربانی فرما کر قرآن و سنت کے حوالے سے اس مسئلے پر روشنی ڈالیں ــــ

امام صاحب درج ذیل کتب کا حوالہ دیتے ہیں -

"حقوق الاولاد" معہ احکام العقیقہ، ناشر: مدرسہ دعوۃ القرآن حشمت منزل موسیٰ لین گلی نمبر ۴، کراچی، اشاعت اول ۱۹۵۷ء، اشاعت دوم جون ۱۹۸۴ء مصنف خلیل العلما مولانا محمد خلیل خان قادری برکاتی مارہروی مہتمم و صدر المدرسین دارالعلوم احسن البرکات ہوم اسٹیڈ مل حیدرآباد -

اس کتاب میں مفتی صاحب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ۸۰ اصول مرتب کیے ہیں کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳ پر "خاص دختر کے حقوق" کے عنوان میں اصول نمبر ۶۸، ۶۹ میں رقمطراز ہیں :-

نمبر ۶۸ ــــ سورۂ نور کی تعلیم دے -

نمبر ۶۹ ــــ لکھنا ہرگز نہ سکھائے کہ احتمالِ فتنہ ہے - (امام ترمذی)

حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اقدس سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا - "لقمان نے ایک لڑکی کو دیکھا کہ مکتب میں سکھائی جارہی ہے فرمایا یہ تلوار کس کے لیے صیقل کی جاتی ہے" امام ابن حجر فرماتے ہیں

اس حدیث میں ممانعتِ کتابت کی علت کی طرف اشارہ ہے کہ عورت لکھنا سیکھ کر خود بھی فاسد غرضوں کی طرف راہ پائے گی اور فاسقوں، بدکاروں، آوارہ مزاجوں اور اوباشوں کو بھی اس تک رسائی کا بڑا موقع ملے گا جو لکھنا نہ جاننے کی حالت میں نہ ملتا، کیونکہ آدمی وہ بات لکھ سکتا ہے جو کسی کی زبانی کہلا کے نہ بھیج سکے تیز خط ایلچی سے زیادہ پوشیدہ ہے۔ اس میں حیلہ و مکر کی بہت جلد راہ ملے گی۔ لہٰذا عورت لکھنا سیکھ کر صیقل کی ہوئی تلوار ہو جاتی ہے۔ انتہی۔ ہندی مثل نے بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسے بوری کوئی دیت ہے سنوارن ہتھیار

اور ظاہر ہے کہ کتابت ایک عظیم نافع چیز ہے۔ اگر عورتوں کے لیے اس فنِ کتابت میں حرج نہ ہوتا تو جمہور علماء اور عظیم مومنین سلف سے لے کر آج تک اس کے ترک پر کیوں اتفاق کرتے۔ تیرھویں صدی ہجری کے آخر تک تیرہ سو سال کی مدت میں صرف گنتی کی چند عورتیں ایسی ملتی ہیں جو کتابت جانتی تھیں۔ جب کہ ہر زمانہ میں لاکھوں مرد کاتب ہوئے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ترجمہ: "عورتوں کو بالاخانوں میں نہ رکھو اور انہیں لکھنا نہ سکھاؤ، کاتنا سکھاؤ اور سورۃ نور کی تعلیم کرو"۔ (ابن حبان۔ بیہقی)

امام صاحب ترمذی کی اختیار کردہ ایک حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی معنی میں بیان کرتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں عام حکم فرما دیا تھا کہ عورتوں کو لکھنا نہ سکھاؤ اور بالاخانوں پر نہ ٹھہراؤ۔

(روض الاخیار الشہ محمد قاسم ابن یعقوب)

امام مسجد صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ تفسیر مظہر۔ کتاب اصلاح معاشرہ (ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ مصنف و مدیر مولانا ابو داؤد صادق صاحب، کتاب پردہ کا شرعی حکم اور کتاب اسلامی زندگی۔ مصنف مفتی احمد یار خاں بھی

یہی مسئلہ لکھتے ہیں۔ اور علامہ فیض احمد اویسی نے بہاولپور سے بھی یہی فتویٰ بھیجا ہے۔

میری درخواست ہے کہ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب :۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

خواتین بھی مردوں کی طرح شرعی احکام، فرائض واجبات، سنن، مستحبات آداب کی مخاطب ہیں۔ ان کے لیے بھی کتاب وسنت عقلی تجرباتی اور دوسرے علوم وفنون سے اتنی مقدار میں واقفیت ضروری ہے کہ وہ اپنی شرعی اور انسانی ذمہ داریاں ادا کرسکیں۔

علم کے لیے سب سے بڑا ذریعہ قلم ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں تعلیم بالقلم کا ذکر فرمایا۔

"اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ و ربك الاكرم الذی علم بالقلم"۔

اس لیے اگر کوئی شخص خواتین کے لیے تعلیم کا قائل ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے لیے تعلیم بالقلم کو بھی تسلیم کرے۔

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے ایک خاتون سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ جب آپ کے نکاح میں آئیں تو آپ نے اس خاتون سے کہا کہ اسے خوشخطی سکھائیں (فتوح البلدان بلاذری)۔

مشہور فقیہہ علامہ کاسانی صاحب بدائع الصنائع کی بیوی فاطمہ کے دستخطوں کے بغیر ان کے والد صاحب تحفۃ الفقہا علاء الدین سمرقندی اور ان کے خاوند علاؤ الدین کاسانی کے فتاویٰ جاری نہیں ہوتے تھے۔ ان فقیہوں کے فتاویٰ پر فاطمہ کے دستخط بھی ثبت ہوتے تھے۔ (المرأۃ بین الفقہ والقانون - ص ۱۶۵)

مشہور محدث حافظ ابن عساکر فرماتے ہیں کہ میرے شیوخ اور اساتذہ میں سے اسّی کے قریب خواتین اساتذہ ہیں۔ جن لوگوں کو خواتین کے بارے میں مغالطہ لگا ہے کہ انہیں

لکھنا پڑھنا سکھانا ٹھیک نہیں ہے ان کے مغالطے کی بنیاد ایک روایت ہے جسے آپ نے بھی نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عورتوں کو لکھنا نہ سکھاؤ"

اس حدیث کے بارے میں ابن جوزی فرماتے ہیں کہ صحیح نہیں ہے اسے حاکم نے اپنی صحیح میں درج کیا ہے اس پر ابن جوزی نے تعجب کیا ہے کہ اس کے راوی ابراہیم شامی کا حال ان سے کیسے مخفی رہا۔ وہ تو شامی محدثین کے نام پر جھوٹی روایتیں روایت کرتا ہے۔

(الموضاعات جلد ۲ ص ۲۶۸)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی صحت اور تحریکی جذبہ میں ترقی عطا فرمائے۔

(مولانا عبدالمالک۔ ناظم شعبہ استفسارات)

(بقیہ کتاب سازی و کتب خانہ سازی)

اور ان کی کتابوں کے تلف ہو جانے پر اُن کی تعزیت کرتے۔ یہ ان سے کہتے تھے:

ذھب الخرج وبقی الدرج

(کتابوں کے بورے بہہ گئے[1] جو قلب پر مسطور تھا رہ گیا)

مذکورۂ بالا تاریخی شواہد سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عہدِ عباسی میں مسلم معاشرہ ہر دو نوع کے کتب خانوں سے مالا مال تھا۔ (باقی)

---

[1] ابن الفرضی، تاریخ العلماء والرواة للعلم بالاندلس تحقیق عزت العطار الحسینی القاہرہ: مکتبة الخانجی، ۱۳۷۳ھ جلد ۱ ص ۳۰۰۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی معرکہ آرا تفسیر "تفہیم القرآن" کی روشنی میں

افہام و تفہیم

آیاتِ قرآنی کے ترجمے کی وضاحت

ترتیب : زبیر حسن رضوی

نظرِ ثانی : مفتی محمد یوسف ۔ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ —————— قیمت : -/۱۲ روپے

مجموعہ مضامین

پیغام بر

مندرجات

- ☆ اسلام کی قرآنی و نبوی بنیادیں ☆ دجّال کی شخصی انفرادیت
- ☆ دست و بازو ☆ بے حیا اور بے غیرت
- ☆ مولانا مودودیؒ

مرتبہ : زبیر حسن رضوی

سائز: $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ —————— قیمت: [illegible] روپے

ملنے کا پتہ

اِدارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ ۔ دربار مارکیٹ [illegible]